فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۰۰

از جولائی ۱۹۶۷ء تا دسمبر ۱۹۶۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شعراء

فہرست مضامینِ معارف

جلد ۱۰۰

از جولائی ۱۹۶۷ء تا دسمبر ۱۹۶۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۰۰ - ماہ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۷ء - عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کی شکست کتنا ہی اندوہ ناک واقعہ ہو مگر تعجب انگیز ہرگز نہیں، بلکہ عین سنت الٰہی کے مطابق اور خود عربوں کے اعمال کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ نے دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کامیابی کے جو شرائط رکھے ہیں وہ نہ صرف دینی بلکہ خالص دنیاوی اور مادی حیثیت سے بھی ضروری ہیں، ان میں سب سے مقدم قوت ایمانی ہے لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ خدا کی نصرت کے وہی مسلمان مستحق ہیں جو اسکے دین کی مدد کرتے ہیں اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۔ اتحاد باہمی وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ آپس کی پھوٹ مہلک ہے وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ۔ مادی سروسامان وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ۔ حالتِ جنگ میں احتیاط اور بچاؤ کی تدبیر يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ متحدہ مقابلہ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ ثابت قدمی اور خدا کی یاد اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

ان احکام کے مقابلہ میں عربوں کا عمل یہ ہے کہ قریب قریب پوری عرب دنیا مغربی تہذیب میں غرق ہے، متحدہ عرب جمہوریہ میں جس کے ہاتھ میں عربوں کی قیادت کی باگ ہے، اسلام ایک قصۂ پارینہ بن گیا ہے اور اسکی حیثیت ایک پرانی یادگار سے زیادہ نہیں ہے، اس کا اصل نعرہ عربی قومیت، کمیونزم اور فرعونی تہذیب ہے، عرب حکومتوں میں پھوٹ اور اقتدار کی جنگ برپا ہے، اور انکی قوتیں دشمن کے مقابلہ کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف صرف ہو رہی ہیں، مصر کی فوجیں مدتوں سے یمن میں مسلط ہیں، سعودی عرب اور اردن کا تختہ الٹنے کی سازش مستقل جاری ہے، جنگی تدبیروں کا یہ حال ہے کہ اسرائیل سے اتنی قربت کے باوجود متحدہ عرب جمہوریہ کو اسکی قوت اور اس کے نقشۂ جنگ کا صحیح اندازہ نہ ہوسکا اور اسکی فوج چند دن بھی اسرائیل کے مقابلہ میں نہ ٹک سکی، ایک ہی حملہ میں اس نے مصر کی

فوجی قوت تباہ کرکے رکھ دی، جو اسلحۂ جنگ موجود تھے ان کے استعمال کی نوبت بھی نہ آسکی۔

اسرائیلی حکومت کے قیام کے سیاسی اسباب اور مصالح سے بحث نہیں، وہ حق ہوں یا ناحق لیکن اس واقعہ سے انکار ممکن نہیں کہ مادی ترقی میں انتہائی عروج اور ہزاروں برس کی خانماں خرابی کے باوجود اپنے مذہب سے یہودیوں کی وابستگی میں فرق نہیں آیا، وہ اپنی روایات کو سینے سے لگائے رہے اور ارض موعود میں واپسی کا جذبہ ان کے دل میں برابر قائم رہا، اور جیسے ہی اس کا موقع ملا، اپنے صدیوں کے سرسبز و شاداب وطنوں اور عیش و آرام کو چھوڑ کر جوق در جوق فلسطین کے صحرا اور عرب حکومتوں کے نرغے میں آکر آباد ہوگئے، اور اپنی دولت، اپنے علم و فن اور دل و دماغ کی ساری قوتیں اپنے استحکام میں صرف کردیں اور پوری یہودی دنیا ان کی حمایت و امداد کے لیے کمربستہ ہوگئی، جنگ کے موقعہ پر جب عربوں کی زبان پر عربی قومیت کی جے'' تھی، یہودیوں نے دن کو روزہ رکھا، رات بھر توراۃ کی تلاوت اور بارگاہ الٰہی میں رو رو کر دعائیں کیں، ایسی حالت میں اگر ان کو عربوں پر فتح حاصل ہوئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے،

سنت اللہ ہر قوم و ملت کے لیے یکساں ہے، خواہ وہ مسلم ہو یا کافر، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا قوموں کے عروج و زوال کے جو فطری قوانین مقرر ہیں، جو قوم بھی اس پر عمل کریگی وہ کامیاب اور سربلند ہوگی، اور جو ان سے اعراض کریگی وہ ناکام اور ذلیل ہوگی۔ "مسلم آئین ہوا کافر تو ملے حور و قصور" مسلمان خدا کے ایسے چہیتے نہیں ہیں کہ وہ اس کے احکام سے سرتابی اور دنیاوی تدبیروں سے غفلت کے باوجود اسکی نصرت کے مستحق رہیں، کلام مجید میں صاف الفاظ میں تنبیہ ہے "وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ" اگر تم احکام الٰہی سے اعراض کروگے تو خدا تمہاری جگہ دوسری قوم کو دیدیگا، جب مسلمان نصرت الٰہی کے مستحق تھے، خدا نے فلسطین ان کو دلوا دیا، جب ان میں اس کی اہلیت باقی نہیں رہی تو پھر ان سے چھین کر یہودیوں کو دلوا دیا۔

اس شکست کی ساری ذمہ داری متحدہ عرب جمہوریہ کی قیادت پر ہے، اس نے اپنے غلط پندار اور خود سری

میں عرب حکومتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا، ان کی مخالفت اس کا مستقل شیوہ رہا، وہ محض کھوکھلے نعرے لگاتی رہی، اس نے وہی کردار دکھایا جو حیدرآباد میں قاسم رضوی نے دکھایا تھا، وقت آنے پر ان نعروں کی حقیقت ظاہر ہوگئی، اسرائیل نے ایک حملہ میں سارا ہوائی قلعہ مسمار کر دیا، اسکے مقابلہ میں مصر کی فوجیں اتنا بھی نہ لڑ سکیں کہ دوسرے عرب ملکوں کی فوجیں مدد کے لیے پہنچ سکتیں، سب سے زیادہ بہادری تو اردن نے دکھائی جو متحدہ عرب جمہوریہ کی نگاہ میں سب سے زیادہ معتوب تھا، اس شکست کی ذمہ داری کسی دوسرے پر ڈالنا صحیح نہیں ہے، جب اپنے میں دم ہو تو دوسرے کی مدد بھی کام آتی ہے، تنہا کسی کے سہارے جنگ نہیں لڑی جاتی، عرب جمہوریہ کو جن دوستوں پر بھروسہ تھا انکی حقیقت بھی ظاہر ہوگئی اور ناصر کی کمیونزم نوازی کچھ بھی کام نہ آئی، انھوں نے اپنی انانیت اور خودسری میں نہ صرف عربوں بلکہ پوری دنیائے اسلام کو رسوا کیا، مگر اب ان کو بھی سبق مل گیا اور یقین ہے کہ اس تجربہ کے بعد ان کی آنکھیں کھل جائیں گی،

بہرحال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اس شکست کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ سمجھکر عربوں کو سبق لینا چاہیے، اگر اب بھی وہ خدا کی طرف رجوع کریں اور آپس میں اتحاد و اتفاق سے کام لیں تو اس کی تلافی ہو سکتی ہے، عرب حکومتوں کے مقابلہ میں اسرائیل کی کوئی بساط نہیں ہے، امریکہ اور برطانیہ اس کو کبتک بچائیں گے، اگر عرب اس کا متحدہ مقابلہ کریں تو اس کو پیس کر رکھ دیں، جب تک اپنے میں قوت نہ ہو کسی دوسرے سے انصاف کی توقع رکھنا بیکار ہے، اقوام متحدہ تو اینگلو امریکن بلاک کا محض آلۂ کار اور کمزور قوموں پر انکی چودھرائی قائم رکھنے کا ذریعہ ہے، عرب اس پر اسی وقت اثر انداز ہو سکتے ہیں جب خود انکی آواز متحد اور ان میں قوت ہوگی، اگر وہ اس کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو اتنے ملکوں کی علیحدگی سے اسکی بنیاد ہل جائیگی، فلسطین کا مسئلہ تنہا عربوں کا نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کا ہے اور اپنے قبلہ اول کا چھڑانا دنیا کے تمام مسلمانوں کا فرض ہے۔

مقالات

حضرت سید صاحبؒ اور ڈاکٹر اقبالؒ

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

یہ مضمون اخبار چٹان لاہور کے اقبال نمبر میں شائع ہوا تھا اور ہندوستان میں بہت کم لوگوں کی نظر سے گذرا تھا، اس لیے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدتمندوں کی جن میں ناظرین معارف بھی ہیں، خواہش تھی کہ اس کو معارف میں بھی شائع کیا جائے۔ یہ مضمون بہت سے علمی و دینی فوائد پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی اشاعت مفید معلوم ہوئی۔ م

مجھ کو دار المصنفین کے احاطہ میں اسی مکان میں رہنے کا فخر حاصل ہے جس میں استاذی المحترم حضرت سید سلیمان ندویؒ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہا کرتے تھے، اس لیے وہ میری نگاہوں میں ہر لمحہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے نظر آتے ہیں، اس مکان سے جب دار المصنفین کے کتب خانہ میں آتا ہوں تو ان کی وہ میز رکھی ہوئی نظر آتی ہے جس پر وہ بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے، اس میز کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ معلوم نہیں اس میز پر سے اسلامی علوم و فنون کے کتنے سرچشمے پھوٹے اور بہے، اور پھر یکایک ڈاکٹر اقبالؒ نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں جنھوں نے حضرت سید صاحبؒ کو علوم اسلامی کی جوئے شیر کا فرہاد کہا تھا، اس طرح اکثر و بیشتر

حضرت سید صاحب اور ڈاکٹر اقبال دونوں ایک ساتھ نظروں کے سامنے آجاتے ہیں، دونوں اپنے اپنے فن کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں لذت محسوس کرتے رہے، جو دونوں کی پاک طینت اور بلند سرشت کی دلیل ہے، اسی کی جھلکیاں اس مضمون میں نظر آئیں گی، اس میں زیادہ تر اقتباسات ہی ہیں لیکن ان کو نقل کرتے وقت مجھ کو بڑی لذت محسوس ہوئی، امید ہے کہ وہی لذت ناظرین کو بھی ہوگی۔

ڈاکٹر اقبال کو حضرت سید صاحبؒ سے شروع ہی سے قلبی لگاؤ رہا، اس لیے ۱۹۱۶ء میں اورنیٹل کالج لاہور میں فارسی کے ایک استاد کی جگہ خالی ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو لکھا کہ اگر وہ اس جگہ کو پسند فرمائیں تو قبول کرلیں، کیونکہ ان کا لاہور میں رہنا پنجاب والوں کے لیے مفید ہوگا لیکن حضرت سید صاحبؒ نے دار المصنفین سے علیحدہ ہونا پسند نہیں فرمایا، اور جب انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ لکھ بھیجا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ دار المصنفین کے کام میں برکت دے، اور ان کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کرے (۱۲؍ نومبر ۱۹۱۶ء) اور پھر ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ جو کام وہ کر رہے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ اور اس کے رسول ان کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے۔ (۱۳؍ نومبر ۱۹۱۶ء)

۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر صاحب کی مشہور کتاب رموزِ بیخودی شائع ہوئی تو انھوں نے حضرت سید صاحبؒ کو اس کا ایک نسخہ بھیجا جس کو پڑھ کر حضرت سید صاحبؒ بہت متاثر ہوئے، اور انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار اپریل ۱۹۱۸ء کے "معارف" میں ایک طویل ریویو میں کیا، جس میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ مولوی رومی نے سات دفتروں میں سات آسمانوں کے خزانے یکجا کر دیے اس لیے اہل معنی میں اس کی بے انتہا مقبولیت ہوئی، ضرورت تھی کہ ہمارے اہل دل شعرا مثنوی مولوی روم کا ایک دوسرا نسخہ ہمارے لیے تیار کر دیں، اشعرائے حال میں ڈاکٹر اقبال کو اللہ تعالیٰ نے

اس ضرورت کے لیے چن لیا، انھوں نے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں، اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی، ان دونوں مثنویوں کا موازنہ کرتے ہوئے حضرت سید صاحب نے لکھا کہ رموزِ بیخودی میرے خیال میں زبان کے لحاظ سے اسرارِ خودی سے بہتر ہے، اور اصل معنی کے لحاظ سے دونوں میں یہ فرق ہے کہ اس میں مظاہر سیاست بیشتر اور اس میں مذہب کے عناصر زیادہ ہیں لیکن منزل مقصود ایک ہے، اسی سلسلہ میں سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ "اس وقت مسلمانوں میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کی جو تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں، ان میں حکمائے ملت مسلمانوں کے مزاج قومی کی تشخیص نہیں کرتے، مسلمانوں کے قومی مزاج کو جن لوگوں نے پہچانا ہے، وہ صرف تین شخص ہیں، مولانا شبلی نے آخری تین سال کے کلام میں، مولانا ابو الکلام نے مجلدات الہلال میں اور ڈاکٹر اقبال نے اپنی دو مثنویوں میں، اور اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستے اوروں پر بھی مکشوف ہو رہے ہیں" حضرت سید صاحبؒ رموزِ بے خودی کی جا بجا تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس مثنوی کے اکثر ابواب میں مذہبی حقائق فلسفیانہ تشریح کے ساتھ صوفیانہ رنگ میں شعر بنتے چلے گئے ہیں، علاوہ ازیں ڈاکٹر اقبال نے اس میں جو اسرار و نکات حل کیے ہیں، ان کی بنیاد پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فن قومیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید کلام کی ایک بہترین کتاب ہے، اس کے اندر توحید کا ثبوت، رسالت کی ضرورت، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب قبلہ کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پر اثر اور تشفی بخش دلائل موجود ہیں۔

حضرت سید صاحبؒ نے اس مثنوی کی زبان پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، ریویو کے آغاز میں انھوں نے لکھا کہ ابتداء ڈاکٹر اقبال کی زبان اشکال پسند اور ترکیب آفریں واقع ہوئی ہے، کبھی کبھی سہل پسندی کے ثبوت کے لیے انھوں نے نہایت رواں اور آسان زبان میں نظمیں لکھیں، لیکن پھر وہ ڈاکٹر اقبال کے اشعار نہ رہے، بلکہ ان کی حیثیت ایک عام اردو شاعر

کے خیالات موزوں کی رہ گئی"۔ آگے چل کر سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو ان شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلہ میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے، لیکن حق یہ ہے کہ اس کی ایک لغزش متانت پر ہزاروں سنجیدہ اور متین زبانیں قربان ہیں، مصرعوں کے دروبست اور فصل و وصل میں قصور ممکن ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرع ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر و نشتر بن کر سننے والوں کے دل و جگر میں نہ اتر جائے شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں، اس لیے اختلاف مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بھی بچ کر نکل نہیں سکتا"۔ آخر میں حضرت سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں "ایک بالغ نظر اس مثنوی میں الفاظ کی صحت یا صحیح فارسی معنی میں ان کے استعمال میں شک اور بعض فارسی محاوروں کی گرفت کرسکتا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ خیالات میں اتنی تیز روانی ہے کہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہو سکتے، اس لیے اس تقریظ میں ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی، نکتہ چینی اور حرف گیری بہت ہو چکی، اب کچھ سوچنا اور سمجھنا بھی چاہئے، اور یہی اس مثنوی کا اہم المطالب ہے"۔

معارف کا یہ ریویو ڈاکٹر اقبال کی نظر سے گذرا تو اپنی فراخدلی، سیر چشمی اور بلند نظری کی بنا پر حضرت سید صاحبؒ کو لکھا کہ "آپ کا ریویو نظر سے گذرا ہے، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے"۔ اور پھر حضرت سید صاحبؒ نے ان کی زبان کے متعلق جو کچھ اشارہ کیا تھا، اس سے اختلاف یا تکدر کا اظہار کرنے کے بجائے یہ تحریر کیا کہ "صحت الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے، ضرور صحیح ہوگا، لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا،

اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجئے تاکہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے، غالباً آپ نے رموز بیخودی کے صفحات پر ہی نوٹ کیے ہوں گے، اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجئے، میں دوسری کاپی اس کے عوض بھجوا دوں گا۔ اس تکلیف کو میں احسان تصور کروں گا"۔ (مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۱۸ء)

ان سطروں میں کتنی خاکساری اور فروتنی تھی، حضرت سید صاحبؒ کئی مہینے تک ڈاکٹر اقبال کے تسامحات کی نشاندہی کرنے سے گریز کرتے رہے، لیکن ڈاکٹر اقبال کا اصرار بڑھا تو انھوں نے ان فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی۔ افسوس ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کے وہ مکاتیب سامنے نہیں ہیں، جو انھوں نے ڈاکٹر اقبال کو لکھے، لیکن اقبال نامہ میں ڈاکٹر صاحبؒ کے جو خطوط ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحبؒ نے جن تسامحات کی طرف توجہ دلائی تھی ان میں سے اکثر و بیشتر سے ڈاکٹر اقبال کو اتفاق نہ تھا، اور انھوں نے بہت سے اساتذہ کی سند پیش کر کے سید صاحب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے، اور غالباً سید صاحبؒ بھی مطمئن ہو گئے تھے، لیکن ڈاکٹر اقبال اپنی عالی ظرفی سے ان کو برابر لکھتے رہے کہ میری خامیوں سے ضرور ضرور آگاہ کیا کیجئے، آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا"۔ (مورخہ ۳ اپریل ۱۹۱۹ء) اور پھر اپنی شاعری کے مطمح نظر کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت سید صاحبؒ کو لکھتے ہیں کہ "شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو، اور بس اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں" (۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء) اور پھر اپنی عالی ظرفی اور خاکساری کا ثبوت یہ لکھ کر دیتے ہیں کہ میرے افکار اس قابل نہیں کہ ان کی تنقید کے لیے سید سلیمان کا دل و دماغ صرف ہو لیکن اگر احباب تبصرہ پر مصر ہیں

تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے، اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگذشت مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں، اور یہ سرگذشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے، مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا۔ (۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۹ء) غالباً ایسی کوئی تحریر ڈاکٹر اقبال کے قلم سے نکلنے نہ پائی۔

حضرت سید صاحبؒ اور ڈاکٹر اقبال کی یگانگت و موانست بڑھتی گئی، اور دونوں باہمی قلبی لگاؤ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے علمی قدردان بھی ہوتے گئے، حضرت سید صاحبؒ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت سے سفر یورپ سے واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو لکھا "آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گذاری کی صورت میں مل رہا ہے، اور دربار نبویؐ سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہو" (۱۰ر اکتوبر ۱۹۲۰ء)۔ پھر حضرت سید صاحبؒ نے اسی سال ان کو اپنی کتاب سیرۃ عائشہؓ بھیجی، تو ڈاکٹر صاحب نے ایک مکتوب میں لکھا: "سیرۃ عائشہ کے لیے سراپا سپاس ہوں، یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے، اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا، خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے۔" (۲۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء)

۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر اقبال کی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر نکلسن نے کیا تو اس ترجمہ پر سید صاحبؒ نے ایک تقریظ مارچ ۱۹۲۱ء کے "معارف" میں شائع کی جس میں وہ لکھتے ہیں: "اقبال کی زبان غالباً بیس برس سے ہندوستان میں زمزمہ پرداز ہے، ہمارے نوجوان کے کان اس کی سامعہ نوازی سے بہت کچھ لذت گیر ہوئے ہیں، لیکن ابتک اس کی قدردانی کا کافی صلہ مصنف کو ہم نے ادا نہیں کیا"۔ اسی زمانہ میں سید صاحبؒ یورپ کے سفر سے واپس ہوئے تھے، اسی لیے لکھتے ہیں کہ پیرس میں جب ہماری ملاقات ذکاء الملک سابق وزیر تعلیمات ایران اور علامہ محمد عبدالوہاب قزوینی (مشہور ایرانی عالم اور صاحب قلم) سے ہوئی اور اہم اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا ذکر آیا تو ہم نے اقبال کے فلسفہ کا ذکر کیا اور محترم محمد علی نے رموز بیخودی اور اسرار خودی کا اپنا نسخہ ان کے مطالعہ کو عنایت کیا، وہ دیکھ کر بیحد محظوظ ہوئے، اس وقت مجھے نظر آیا کہ ان کی فارسی زبان نے ان کے دائرۂ اثر کو کتنا بڑھا دیا ہے"۔ پروفیسر نکلسن نے اسرار خودی کی نظم کا ترجمہ نظم کے بجائے نثر میں کر دیا ہے، سید صاحب نے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے ڈر ہے کہ شاعری کی لطافت دور ہو کر یہ مثنوی دوسری زبانوں میں فلسفہ کی کوئی بوجھل کتاب نہ بن جائے۔

۱۹۲۲ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں ڈاکٹر اقبال نے اپنی مشہور نظم خضر راہ پڑھ کر سنائی تو یہ نظم چھپ کر عام نہیں ہونے پائی تھی کہ حضرت سید صاحب نے اس کے کچھ بند مئی ۱۹۲۲ء کے معارف میں شائع کیے، اور اس پر شروع میں جو تحریر لکھی اس کے کچھ حصے یہ ہیں:

"ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم گو جوش بیان میں ان کی پچھلی نظموں سے کم ہے لیکن اسی حیثیت سے تعقید اور غرابت میں بھی کمی ہے، ان کی شاعری کا اصلی جوہر فلسفہ اور تخیل کی مصالحانہ آمیزش ہے، اور انکی یہ خصوصیت اس نظم میں بھی نمایاں ہے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے جب یہ نظم جلسہ میں پڑھنا شروع کی تو مجلس پر ایک سماں بندھ گیا، اکثر مصرعوں پر سامعین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن نظم کے دو مصرعوں نے خود شاعر کی آنکھوں کو اشکبار کر دیا۔

ع۔ بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ

ع۔ ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو

اور پھر سید صاحبؒ نے لکھا کہ ہم کو اس نظم کے جس شعر نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ایسی ہے کہ اس کی شرح لکھنی چاہیے"۔

اور جب یہ تحریر ڈاکٹر اقبال کی نظر سے گذری تو انھوں نے حضرت سید صاحبؒ کو لکھا کہ

"خضرِ راہ کے متعلق آپ نے جو نوٹ لکھا اس کا شکریہ قبول فرمایئے، جوشِ بیان کے متعلق آپ نے جو نوٹ لکھا ہے وہ صحیح ہے، مگر یہ نقص اس نظم کے لیے ضروری تھا (کم از کم میرے خیال میں) جناب خضر کی پختہ کاری ان کا تجربہ اور واقعات و حوادثِ عالم پر ان کی نظر، ان سب باتوں کے علاوہ ان کا انداز طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے، اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو، اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہوا تھا، اور جناب خضر کے اندازِ طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا، یہ بند اب کسی اور نظم کا حصہ بنجائیں گے،" (۲۹ مئی ۱۹۲۲ء)۔ ان سطروں سے ڈاکٹر اقبال کی بالغ نظری اور باریک بینی کا صحیح اندازہ ہوگا۔

پھر معارف کی اسی اشاعت میں حضرت سید صاحب نے ڈاکٹر اقبال کی "پیام مشرق" کی ترتیب کی خبر یہ لکھ کر دی کہ "ہم ناظرین کو ایک اور خوشخبری سنانا چاہتے ہیں، ڈاکٹر اقبال ملک کے ان پر شور ایام میں خاموش نہیں رہے ہیں، جرمنی کے ایک شاعر گوئٹے نے اپنے جس مجموعۂ اشعار کا نام مشرقی دیوان رکھا ہے، مغرب کا مشرق پر اب تک یہ قرض چلا آتا تھا، ہمارا مشرقی شاعر اب اس قرض کے بارے سے مشرق کو سبکدوش کرنا چاہتا ہے، جب ڈاکٹر صاحب کے والا نامہ سے معلوم ہوا کہ انھوں نے گوئٹے کے جواب میں فارسی اشعار کا ایک مجموعہ لکھا ہے جو عنقریب شائع ہوگا، اس کے دیباچہ میں ڈاکٹر اقبال یہ دکھائیں گے کہ فارسی لٹریچر نے جرمن لٹریچر پر کیا اثر ڈالا ہے، ابھی گذشتہ اورنیٹل کانفرنس کلکتہ میں ڈاکٹر جیون جی جمشید نے تقریباً اس موضوع پر ایک مضمون پڑھا تھا، امید ہے کہ ڈاکٹر اقبال کا قلم ان سے زیادہ سیراب کن ہوگا،" ڈاکٹر صاحب نے یہ تحریر پڑھی تو حضرت سید صاحب کو لکھا کہ پیام مشرق پر جو نوٹ آپ نے معارف میں لکھا ہے، اس کے لیے سراپا سپاس ہوں، پروفیسر نکلسن کا خط آیا ہے، انھوں نے اسے بہت پسند کیا ہے .... مگر میرے لیے آپ کی رائے پروفیسر

نکلسن کی رائے سے زیادہ قابل افتخار ہے۔" (۵ جولائی ۱۹۲۳ء)

اقبال نامہ میں حضرت سید صاحب کے نام سے ڈاکٹر صاحب کے جو خطوط ہیں ان کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گو ڈاکٹر صاحب علم و فلسفہ کے پہاڑ اور سمندر بنتے چلے جا رہے تھے لیکن کسی حال میں بھی اپنے علم کی بلندی اور گہرائی کا اظہار پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ جب ضرورت ہوتی تو اپنی عالمگیر شہرت اور عظمت کا خیال کیے بغیر حضرت سید صاحب سے علمی و مذہبی استفسارات کرنے میں مطلق نہیں ہچکچاتے تھے، انھوں نے جو جو سوالات کیے ان کو سنہ وار مرتب کر دیا جائے تو ان سے ان کے ذہنی تجسس اور تفحص کے ساتھ ان کے ذہنی ارتقاء کا بھی اندازہ ہوگا، اسی غرض سے یہ تمام استفسارات یہاں پر درج کیے جارہے ہیں:۔

"دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین وکلاء کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لیے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل، پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیے لاتے ہیں، یہ ہدایا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں، کیا یہ مال مسلمان کے لیے حلال ہے؟" (۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء)

"یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ حمیرا والی سب احادیث موضوعات میں ہیں، کیا کلمینی یا حمیرا بھی موضوع ہے، کمال کا شعر کیا عرفی کا ہے:۔

ایں تصرف ہائے من در شعرِ من — کلمینی یا حمیرائے من است (۲۳ دسمبر ۱۹۲۰ء)

"کیا حکمائے صوفیہ اسلام میں کسی نے زمان و مکان کی حقیقت پر بحث کی ہے؟ (۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

"دو باتیں دریافت طلب ہیں: (۱) متکلمین میں سے بعض نے علم مناظرہ و مرایا کے رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی روایت ممکن ہے، یہ بحث کہاں ملے گی؟ میں اس مضمون کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

(۲) مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے:

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینے ہم بود

حال کے ہیئت داں کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی

ممکن ہے، اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے، اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ شیخ اشراق تناسخ کے ایک شکل میں قائل تھے، ان کے اس عقیدہ کی وجہ یہی تو نہ تھی؟ (۲۰ اپریل ۱۹۲۲ء)

مردانِ خدا خدا نباشند — لیکن ز خدا جدا نباشند

کس کا شعر ہے؟ ایک امر کے لیے اس کی تحقیق ضروری ہے، ممکن ہے آپ کی نظر سے کسی تذکرہ میں یہ شعر گذرا ہو۔" (۳ اگست ۱۹۲۲ء)

"مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی کا رسالہ تحقیق زمان مطبوعہ ہے یا قلمی؟ اگر قلمی ہے تو تو کہاں سے عاریۃً ملے گا۔ علیٰ ہذا القیاس مولانا شاہ اسمٰعیل کی عبقات، قاضی محب اللہ کی جوہر الفرد اور حافظ امان اللہ بنارسی کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی۔ .... جن کتابوں کا آپ نے اپنے والا نامہ میں ذکر فرمایا ہے، کیا آپ کے کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہیں؟ اگر ہوں تو میں چند روز کے لیے وہیں حاضر ہو جاؤں اور آپ کی مدد سے ان میں سے بعض کو دیکھ سکوں......

حضرت ابن عربی کے بحث زمان کا ملخص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہوگی۔ ...... (۲۲ اگست ۱۹۲۲ء)

آپ حضرت اویس اور ان تمام صوفی روایات کے متعلق جو ان سے منسوب ہیں، کیا خیال رکھتے ہیں اگر امام مالک کی تحقیق زیر نظر ہو تو از راہ عنایت حوالے سے آگاہ فرمایئے گا۔ (۲۳ جنوری ۱۹۲۴ء)

مسلمانوں نے منطق استقرائی پر جو کچھ لکھا ہے اور جو اضافے انھوں نے یونانیوں کی منطق پر کیے ہیں اس کے متعلق میں کچھ تحقیق کر رہا ہوں، میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں گا اگر از راہ عنایت اپنی وسیع معلومات سے مجھے مستفیض فرمائیں، کم از کم ان مقالوں کے نام تحریر فرمایئے جن کو پڑھنا ضروری ہے... (یکم فروری ۱۹۲۴ء)

کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے حالات کی اشاعت ہوئی تھی؟ اس کے متعلق آگاہی کی ضرورت ہے، مفتی عالم جان جن کا حال میں انتقال ہوگیا ہے، ان کی تحریک کی

اصل غایت کیا تھی؟ کیا یہ محض تعلیمی تحریک تھی یا اس کا مقصود ایک مذہبی انقلاب بھی تھا؟ تکلیف دہی کے لیے معافی چاہتا ہوں اور یہ بھی التماس کرتا ہوں کہ اس عریضہ کا جواب جہاں تک ممکن ہو جلد دیجئے۔" (یکم مئی ۱۹۲۴ء)

"حال میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی کولمبیا نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام "مسلمانوں کے نظریہ متعلقہ مالیات" ہے، اس کتاب میں لکھا ہے، اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے...... اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے۔" (۸ اگست ۱۹۲۴ء)

"آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ فقہاء نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز رکھی ہے، ایسی تخصیص یا تعمیم کی مثال اگر کوئی ہے تو اس سے آگاہ فرمایئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماع صحابہ ہی کر سکتا ہے یا علمائے مجتہدین امت بھی کر سکتے ہیں...... کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ نے نص قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو اور وہ کونسا حکم ہے"...... (۲۷ اگست ۱۹۲۴ء)

"آپ نے کسی گذشتہ خط میں مجھے لکھا تھا کہ حضور سرور کائنات سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو آپ بعض دفعہ وحی کا انتظار فرماتے، اگر وحی نازل ہوتی تو اس کے مطابق مسائل کا جواب دیتے اور اگر وحی کا نزول نہ ہوتا تو قرآن شریف کی کسی آیت سے استدلال فرماتے...... اس کا حوالہ کونسی کتاب میں ملے گا؟ کیا یہ قاضی شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول سے آپ نے لیا ہے؟" (۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء)

"آیۂ توریث میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے صرف وہی ناقابل تبدیل ہے، اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے۔ آیۂ وصیت پر بھی جو ارشادات ہیں، میری سمجھ میں نہیں آئے، اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں، جب فرصت ملے جزئیات سے بھی آگاہ فرمایئے، اس احسان کے لیے ہمیشہ شکر گذار ہوں گا۔" (۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء)

"امام ایک شخص واحد ہے یا جماعت بھی امام کے قائم مقام ہو سکتی ہے، ہر اسلامی ملک کا

اپنا امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک واحد امام ہو، مؤخر الذکر صورت موجودہ فرق اسلامیہ کی موجودگی میں کیونکر بروئے کار آسکتی ہے؟ مہربانی کرکے ان سوالات پر روشنی ڈالئے“ ...... (۷ راپریل ۱۹۲۶ء)

”اجتہاد کی بنا محض عقل بشر اور تجربہ و مشاہدہ ہے یا یہ بھی وحی میں داخل ہے اس پر آپ کیا دلیل قائم کرتے ہیں ...... وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں چلتا ہے یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں؟“

”حضور نے اذان کے متعلق صحابہ سے مشورہ کیا، کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت میں آئیگا یا امامت کے تحت میں؟ ...... امام ابو حنیفہ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچہ کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جاسکتا، اس مسئلہ کی اساس کیا ہے“؟ (۲۴ راپریل ۱۹۲۶ء)

”شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے، بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے ...... کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے، اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟ ...... (۷ رمارچ ۱۹۲۸ء)

”کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند فرما کر مجھے ارسال فرمادیں، میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا، صرف خلاصہ چاہتا ہوں جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا“ (۱۸ رمارچ ۱۹۲۸ء)

”مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ کا ایک ٹکڑا جو ترجمہ کیا ہے ...... اس میں شعار تعزیرات ...... ہے، مہربانی کرکے فرمائیے کہ لفظ شعار سے کیا مراد ہے، اور اس کے تحت میں کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں، اس لفظ کی مفصل تشریح مطلوب ہے، جواب کا سخت انتظار رہے گا“ (۲۲ رستمبر ۱۹۲۹ء)

”حضرت محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث

کس کس جگہ ہے؟ ...... حضرات صوفیہ میں اگر کسی بزرگ نے بھی اس مضمون پر بحث کی ہو تو اسکے حوالے سے بھی آگاہ فرمائیے، متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقت زمان یا آن سیال پر مختصر اور مدلل بحث کون سی کتاب میں ملے گی“ (۸ راگست ۱۹۳۳ء)

نور الاسلام کا عربی رسالہ بابت مکان ...... قلمی یا مطبوعہ ہے، نور الاسلام کا زمانہ کونسا ہے- (۸ رستمبر ۱۹۳۳ء)

ملا محب اللہ بہاری کی کتاب جوہر الفرد کہاں ملے گی۔ (۱۰ رستمبر ۱۹۳۳ء)

”اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے، اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیے، یا یوں کہیے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے، کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطۂ خیال سے صحیح ہے، اس کا جواب شاید فتوحات میں ہی ملے، مہربانی کرکے تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرمائیے اور دیکھیے کہ کیا انھوں نے مکان پر بھی کچھ بحث کی ہے، اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے، اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں اور جواب جہاں تک ہو جلد مانگتا ہوں“ (۱۵ ردسمبر ۱۹۳۳ء)

”دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے ...... نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپکے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک مدد ہوسکتا ہے، اس بحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیے“ (۱۵ رجنوری ۱۹۳۴ء)

”احکام منصوصہ میں توسیع اختیارات امام کے اصول کیا ہیں؟ اگر امام توسیع کرسکتا ہے تو کیا ان کے عمل کو محدود بھی کرسکتا ہے؟ اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح فرمائیے۔ زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ ...... اگر کوئی اسلامی ملک روس کی طرح زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرع اسلامی کے موافق ہوگی، یا مخالف، اس مسئلہ کا سیاست اور اجتماع معاشرت

سے گہرا تعلق ہو، کیا یہ بات بھی رائے امام کے سپرد ہوگی، صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں؟ صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے؟" (یکم فروری ۱۹۳۴ء)

"قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے، ان میں کون سے نبی باہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ، یا سب کے سب بغیر ہمزہ ہیں، لفظ نار کا روٹ عربی زبان میں کیا ہے، لفظ نجات کا روٹ کیا ہے، اور روٹ کے لحاظ سے اس کے معنی کیا ہیں۔" (۶ ستمبر ۱۹۳۴ء)

ان استفسارات کے جوابات حضرت سید صاحب برابر دیتے رہے، افسوس ہے کہ وہ محفوظ نہیں ہیں، شاید ڈاکٹر اقبالؒ کے کاغذات میں ہوں، اگر وہ بھی شائع کردیے جاتے تو بہت سے مفید مذہبی، فقہی، تاریخی اور علمی معلومات حاصل ہوجاتے، سید صاحبؒ نے اقبال نامہ کے مرتب کو ڈاکٹر صاحب کے خطوط بھیجتے وقت کچھ حواشی ضرور لکھ دیے تھے، مگر وہ سب ہی مختصر اور ناکافی ہیں، لیکن خود ڈاکٹر صاحب کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب جو جوابات دیتے ان سے ڈاکٹر صاحب کو پوری تشفی ہوجاتی، اسی لیے وہ اپنے خطوط میں لکھتے رہے :-

"آپ کا نوازش نامہ قوتِ روح اور اطمینان قلب کا باعث ہے۔" (۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء)

"نوازش نامہ ابھی ملا ہے، جس کے لیے بہت شکرگذار ہوں، جتنی آگاہی آپ نے دی ہے، وہ اگر زمانہ فرصت دے تو باقی عمر کے لیے کافی ہے۔" (۲۲ اگست ۱۹۲۲ء)

"نوازش نامہ معلومات سے لبریز ہے، نہایت شکرگذار ہوں۔" (یکم فروری ۱۹۲۴ء)

"آپ اپنے نوازش نامہ کی طوالت کے عذر خواہی کرتے ہیں، مگر میرے لیے یہ طویل خط باعث خیر و برکت ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، میں نے اسے کئی دفعہ پڑھا ہے، اور گذشتہ رات چودھری غلام رسول مہر سے بھی پڑھوا کر سنا، اور احباب بھی اس مجلس میں شریک تھے، اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی

کچھ خدمت کرسکتا۔" (۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء)

ڈاکٹر اقبال کے اس آخری اقتباس میں ان کے عجز و انکسار کے ساتھ ان کی شرافت اخلاق اور شرافت طبع بھی نمایاں ہے، جو ان کی طبیعت کا سب سے بڑا جوہر تھا، اور جو خود ان کا اسلامی کا ہمالیہ بنا ہوا تھا، اس نے یہ لکھنے میں بالکل تامل نہیں کیا کہ علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے۔ (۱۴ ستمبر ۱۹۳۳ء)

ڈاکٹر صاحبؒ حضرت سید صاحبؒ کو مفید مشورے بھی دیتے رہے، ایک بار سید صاحبؒ نے ان کو اپنی ایک غزل بھیجی تو انھوں نے لکھ بھیجا کہ آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص مجھے یہ شعر بہت پسند آیا

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں　　وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

لیکن ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کو یہ بھی مشورہ دیا کہ مولانا شبلی کی طرح تاریخی نظمیں لکھیں، سید صاحب کو شاعری سے صرف اسی حد تک لگاؤ رہا کہ جب ان پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی تو کوئی نظم یا کوئی غزل کہہ دیتے، ورنہ ان کا زیادہ وقت تصنیف و تالیف میں ہی صرف ہوتا، ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ یاجوج ماجوج پر کوئی مضمون لکھیں، کیونکہ یہ امر تحقیق کا محتاج ہے، (یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء)۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے سید صاحب اس پر کوئی مضمون قلمبند نہ کرسکے، پھر اپنے ایک خط (مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء) میں ڈاکٹر صاحب سید صاحب کو لکھتے ہیں کہ اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہو کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے، اگر مولانا شبلی ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا، موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا، یہ کام سید صاحبؒ خود تو نہ کرسکے، لیکن انھوں نے اپنے رفیق کار مولانا عبدالسلام ندوی سے علامہ خضری کی تاریخ فقہ اسلامی کا ترجمہ کرایا، جس کے کئی اڈیشن اب تک دارالمصنفین سے شائع ہوچکے ہیں، پھر ایک اور خط میں لکھتے ہیں، دارالمصنفین کی طرف سے ہندستان کے حکمائے اسلام

پر ایک کتاب لکھنی چاہیے، اس کی سخت ضرورت ہے، عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں ہیں۔ (۴ر ستمبر ۱۹۳۳ء)

سید صاحبؒ نے مولانا عبدالسلام ندوی سے حکمائے اسلام دو جلدوں میں لکھوائی ہے، جس میں ہندوستان کے حکماء کا بھی ذکر آگیا ہے،

ڈاکٹر صاحب کو زمان و مکان کے فلسفہ سے بڑی دلچسپی رہی، اس لیے وہ اپنے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں کہ میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے، یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، میرے خیال میں آپ کو چاہیے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں۔ (۱۵ر دسمبر ۱۹۳۳ء) لیکن حضرت سید صاحب اس کام کو انجام دینے کی فرصت نہ ملی۔

علم و فن کے ان دو سیاروں کا قران السعدین بھی ہوتا رہا، ڈاکٹر صاحب تو کبھی اعظم گڈھ تشریف نہیں لائے، لیکن حضرت سید صاحب کو لاہور جانے کا بارہا اتفاق ہوا، جہاں وہ ڈاکٹر صاحب سے ملتے رہے، ڈاکٹر صاحب کو جب سید صاحبؒ کے لاہور آنے کی خبر ملتی تو ان کو اپنے ہی یہاں مہمان ٹھہرانا پسند کرتے، (دیکھو اقبال نامہ مکتوب مورخہ ۵ر جولائی ۱۹۳۲ء) لیکن دونوں کو ۱۹۳۳ء کے سفر افغانستان میں ایک ساتھ رہنے کا زیادہ موقع ملا، اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے ڈاکٹر صاحب راس مسعود اور سید صاحب کو افغانستان کی بعض علمی اور تعلیمی اصلاحات کے سلسلہ میں افغانستان مدعو کیا تھا، سید صاحب نے اس سفر کے دلچسپ کوائف ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء کے معارف کی کئی اشاعتوں میں قلمبند کیے ہیں، ان میں ڈاکٹر صاحب کی جن جن باتوں سے متاثر ہوئے ان کو بھی اپنے احاطہ تحریر میں لائے ہیں۔

ایک موقع پر چینی ترکستان کا ذکر آیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے ان ہی جہازوں کے ذریعے مشرق کو مغرب سے ملا دیا، لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ جنت جلد فنا ہو جائیگی، اب آیندہ مشرق وسطیٰ کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا، اور تری کے بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کریگا، تجارتی قافلے اب موٹروں، لاریوں، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعہ مشرق و مغرب میں آئے جائیں گے اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گذرے گا، اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا، ڈاکٹر صاحب کی یہ پیشین گوئی بڑی حد تک صحیح تھی، آج مشرق وسطیٰ میں جو سیاست کھیلی جا رہی ہے اور وہاں آئے دن جو انقلاب ہوتے نظر آ رہے ہیں، ان کا مطالعہ کر کے ڈاکٹر صاحب کی سیاسی فراست اور دور بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

افغانستان میں ہندوستانی مہمانوں کے اعزاز میں انجمن ادبی کابل نے ایک دعوت دی، تو اس میں تقریریں بھی ہوئیں، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کی تقریر فلسفیانہ انداز میں بہت ہی پُر اثر تھی، اس پوری تقریر کو سید صاحبؒ نے معارف (مارچ ۱۹۳۴ء) میں نقل کیا ہے، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:-

"میرا یہ عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا مصوری یا موسیقی یا معماری جو بھی ہو، ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے، اور اسی بنا پر آرٹ کو چاہیے کہ میں ایجاد کہوں نہ تفریح، شاعر ایک قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد یا برباد کر سکتا ہے، اس وقت جب حکومت کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ اخلاف نوجوانوں کے لیے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت و بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں، کیونکہ شاعر جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اسکو

بٹھا کر دکھاتا ہے، اس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا ہے، اور جو حسن قوت سے
خالی ہو وہ محض ایک پیغام موت ہے۔

دلبری بے قاہری جادوگری است ‌ ‌ ‌ دلبری با قاہری پیغمبری است

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے شاعری اور شاعر سے متعلق ایک عجیب نکتہ پیدا کیا، جو غور
کرنے کے لائق ہے، انھوں نے فرمایا

"ایک قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل و صورت نہیں بلکہ جو چیز حقیقت میں قوم
کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے وہ تخیل ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ
بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے، قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا
ہوتی ہیں، اور اہل سیاست کی پامردی سے نشو و نما پاکر مر جاتی ہیں، جو قوم ترقی کے راستہ پر
چل رہی ہے اس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، مگر وہ تربیت جس کا
خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے۔"

آخر میں انھوں نے تمام افغانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو اس کی قبائلی زندگی سے
نکال کر وحدت ملی کی زندگی سے آشنا کر دے۔"

یہ ہندوستانی مہمان غزنی پہنچے تو حکیم سنائیؒ کے مزار کی بھی زیارت کی، سید صاحبؒ
اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"حکیم و شاعر اقبال کو حکیم و شاعر سنائی کے مزار کے دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا...
جب ہم وہاں پہنچے تو مزار کے اندر بطریق مسنون دعا پڑھی، حکیم سنائی کی جلالت شان
سے کون واقف نہیں، ہم سب اس منظر سے متاثر تھے، مگر ہم میں سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال

پر تھا، وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے، اور دیر تک زور زور سے روتے رہے،
اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ۔

واپسی میں چمن سے کوئٹہ تک سید صاحبؒ اور ڈاکٹر صاحبؒ دونوں نے ایک موٹر میں سفر کیا، سید صاحبؒ
تحریر فرماتے ہیں کہ راستہ میں ڈاکٹر صاحب نے روحانیات کے ذاتی مشاہدات اور تجربے اور سچے پیر کی
تلاش پر گفتگو شروع کر دی، مختلف شیوخ اور بزرگان سلاسل کا تذکرہ رہا، گفتگو میں ڈاکٹر صاحب
نے اپنے والد کا بھی ذکر کیا تو اس سلسلہ میں سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"اس ضمن میں معلوم ہوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حیات خفتہ کے تاروں میں
جس مضراب نے حرکت پیدا کی، وہ خود ان کے والد ماجد کی ذات بابرکات تھی، گفتگو میں
ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد مرحوم کا ایک ایسا فقرہ سنایا جس نے میرے دل پر بے حد اثر کیا، فرمایا کہ
اپنے وطن سیالکوٹ میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا، ایک صبح کو نماز کے بعد
حسب دستور میں تلاوت میں مصروف تھا کہ والد صاحب مرحوم ادھر آئے، اور دریافت کیا کہ کیا کرتے ہو،
ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کرتا ہوں، فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ
قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح اترا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اقدس
پر نازل ہوا تھا، تلاوت کا مزہ نہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، فرمایا جب بی، اے
پاس ہو جاؤ گے تو بتاؤں گا، کچھ دنوں کے بعد جب انھوں نے بی اے کر لیا تو اس دن کی گفتگو
کا حوالہ دیکر اس مقام کے حصول کی تدبیر پوچھی، مرحوم نے ان کو کچھ طریقے اور دعائیں بتائیں اور
نوجوان بیٹے سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان و قلم سے ملت محمدی کی خدمت بجالاتا رہیگا، ڈاکٹر صاحب
کی شاعری ان کے والد مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی اور ایک عالم انکے نغمہ سے
سرشار و مست تھا اور مسلمانوں میں وہ قیامت انگیز تاثیر پیدا کر رہا تھا۔

باپ اپنے بیٹے کی اس علیٰ نفسی سے مسرور ہو کر اس دنیا سے سدھارا،

حضرت سید صاحب افغانستان کے سفر سے لوٹے تو ڈاکٹر اقبال کی عالی ظرفی اور اخلاق کی پاکیزگی کے علاوہ انکی فکر و نظر کی بلندی سے اور بھی زیادہ متاثر تھے، اور دارالمصنفین کی نجی مجلسوں میں بارہا کہا کہ اسلام میں صدیوں کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا مفکر پیدا ہوا ہے، ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ کابل ہی کے سفر میں انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جب تک آپ کی شاعری ہندوستان میں باقی رہے گی، ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا، یہ سنکر ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب سے فرمایا کہ نہیں، جب تک دارالمصنفین کا لٹریچر ہندوستان میں رہیگا اُس وقت تک ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا، سر راس مسعود بھی اس موقع پر موجود تھے، انھوں نے کہا "بس یوں کہیے جب تک ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور دارالمصنفین کا لٹریچر باقی رہیگا ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا"،

۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر اقبال کا مجموعۂ کلام بال جبریل شائع ہوا تو اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کو بھی بھیجا، جب یہ نسخہ دارالمصنفین پہنچا تو سید صاحب نے بہت ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کیا، بار بار پڑھا، اپنے رفقائے کار کو پڑھ کر سنایا، ان سے پڑھوا کر سنا اور پھر جون ۱۹۳۵ کے معارف میں اس پر ایک لمبی تقریظ بھی لکھی، جس کے شروع میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کا آغاز اردو شاعر کی حیثیت سے کیا، مگر کم از کم بیس برس سے وہ اپنے سامعین کی وسعت اور دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصہ تک اسکو پہنچانے کی خاطر اپنے حکیمانہ اسلامی خیالات کو مناسب پیرایہ بیان میں ادا کرنے کے لیے فارسی میں اظہار خیال کرنے لگے اور مولانا رومی کی رہنمائی میں آسمانوں کی سیر فرماتے رہے، اب بال جبریل کی مدد سے وہ پھر زمین پر اتر رہے ہیں، مگر اس زمین پر بھی وہ آسمانوں ہی کے لیے آمادۂ پرواز ہیں،

پھر یہ بتا کر اس مجموعہ کے مختلف حصوں میں کیا کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ہر نظم میں شاعر نے طرح طرح سے خداوند جل علا کی شان غیوری کو حرکت میں لانے کی کوشش کی ہے، کہیں وہ روٹھا ہے کہیں وہ رویا ہے، کبھی سجدہ میں

گر پڑا ہے، کبھی اٹھ کر تن گیا ہے اور اپنی بندگی و عبودیت پر اترا رہا ہے اور پھر فوراً ہی اپنی عاجزی و درماندگی کی ساری بساط کو اس بارگاہ بے نیاز میں نذر لاتا ہے۔۔۔۔۔ کبھی غزنی میں سنائی کے مزار پر کبھی قرطبہ کی مسجد میں کبھی فلسطین کے بیت المقدس میں اور کبھی یورپ کے تماشا گاہوں میں شاعر کو مسلمانوں کی ناخود شناسی پر رونا آتا ہے، کبھی وہ ان کو سمجھاتا ہے، کبھی شرماتا ہے، کبھی دھمکاتا ہے، کبھی رلاتا ہے اور ہر طرح کی کوشش کرتا ہے کہ مسلمان اپنی حقیقت کو سمجھیں اور اسلام کا پیغام لے کر وہ پھر پہنائے ارض کے گوشہ گوشہ میں دوڑ جائیں۔

سید صاحب شروع میں تو ڈاکٹر اقبال کی زبان کے کچھ ناقد ضرور تھے، لیکن اس مجموعہ کا مطالعہ کر کے ڈاکٹر اقبال کی زبان سے متعلق انکی رائے بدل گئی، اسی لیے بڑی فراخدلی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ بال جبریل کی نسبت سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں شاعر نے بانگ درا سے بڑھ کر اپنی شاعرانہ صفت، سلاست، روانی، بے تکلفی اور زبان کی صحت میں حیرت انگیز کامیابی کا ثبوت دیا ہے، اور عجب نہیں کہ بال جبریل کو دیکھ کر لکھنؤ اور دہلی کے صنعت گر سخنور بھی پنجاب کے سخندان کا لوہا مان لیں، زبان میں غزل کی سی شیرینی تو نہیں مگر قصائد کی سی جزالت اور متانت پوری طرح موجود ہے۔

۱۹۳۶ء میں سید صاحب اور ڈاکٹر صاحب دونوں کی صحت بہت خراب رہی، سید صاحب دیرہ دون جا کر مقیم ہو گئے تھے، اور ڈاکٹر صاحب بھوپال میں علاج کرا رہے تھے، پھر بھی اگست ۱۹۳۶ء میں وہ سید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ وہ قوانین اسلام پر ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے سید صاحب سے مشورے بھی طلب کیے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی، لیکن اسی سال ان کا مجموعۂ کلام ضرب کلیم شائع ہوا، انھوں نے سید صاحب کو یہ بھیجا تو سید صاحب نے اکتوبر ۱۹۳۶ء کے معارف کے شذرات میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"ہمارے حکیم شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ایک نیا ادبی مجموعہ ضرب کلیم کے نام سے ظاہر ہوا ہے، اس میں موصوف کی وہ تازہ اردو نظمیں ہیں، جن میں اسلام کے نقطۂ نظر سے زمانہ موجودہ کے خیالات پر تبصرہ کیا گیا ہے، لیکن معلوم نہیں کہ حضرت کلیم کی وہ ضرب ہے جو بحر احمر پر پڑی تھی جس سے دریا پھٹ گیا تھا اور اس سے ایک قوم آزاد اور دوسری برباد ہوئی تھی یا وہ ضرب ہے جو وادی تیہ کی ایک چٹان پر پڑی تھی جس سے پانی کی بارہ دھاریں بنی اسرائیل کے پیاسوں کے لیے پھوٹی تھیں، بہرحال ان دو میں سے جو ہو وہ ہمارے لیے فال نیک ہے۔"

آگے چل کر سید صاحب لکھتے ہیں:-

"حضرت اقبال کی شاعری اب شاعری کی حدود سے نکل کر خالص حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے، ان من الشعر الحکمۃ کے خلعت نبوی سے سرفراز ہو چکی ہے، اب ان کی شاعری میں جذبات کا سراب نہیں بلکہ عقل و حکمت کا چشمۂ حیات ہے، اب وہ لطف و لذت نہیں بلکہ بصیرت و موعظت ہے، وہ مسلمانوں کو اب ان کے بزرگوں کا تاریخی پیغام سنانے کیلئے نہیں بلکہ ان قوموں کے عروج اور زوال کا فلسفہ سمجھانے کے لیے ہے، اب وہ میدان جنگ کا رجز یا مسافران راہ کے لیے بانگ درا نہیں بلکہ غور و فکر کے غار حرا سے ناموس اکبر کی آواز اور جبریل امین کا پیام ہے۔"

اور جب اپریل ۱۹۳۸ء میں سید صاحب کو ڈاکٹر اقبال کی وفات کی خبر ملی تو وہ نہایت رنج و غم میں اٹھ اٹھ کر ٹہلتے تھے، ان کو یاد کرتے اور انکی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، جیسے ان کے کسی عزیز خاص کی المناک موت ہو گئی ہو، بھرائی ہوئی آواز سے ان کی زندگی کے مختلف واقعات سناتے اور اپنے رفقائے کار سے کئی روز تک ان ہی کا ذکر سننا پسند فرماتے، پھر اسی شور غم میں ماتم اقبال کی سرخی قائم کر کے ڈاکٹر اقبال پر ایک تحریر لکھنے بیٹھ گئے اور جب یہ ختم ہوئی تو اس کے ہر جملہ سے انکے رنج و الم

اور سوز و گداز کا اندازہ ہوتا ہے، خود پیکر غم بنکر انھوں نے یہ تحریر لکھی ہے، اور شاید ان کے قلم سے اس سے بہتر کوئی اور تحریر نہ نکلی، اس کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں:-

"وقت الواقعہ" آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا، صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شعر کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی۔ ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروان کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید یہ صدیوں کے بعد پیدا ہو، اسکے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کی ہر پرواز بال جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہو گئی لیکن اسکی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بنکر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر اب شاعر الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہونگے، خداوند اس کے دل شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا غمخواری فرما اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلب حزیں کو مسرور کر۔"

پھر سیرۃ النبی کے مصنف کی یہ رائے پڑھنے کے لائق ہے کہ مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام لاتا تھا، وہ توحید خالص کا پرستار، دین کامل کا علم بردار، تجدید ملت کا طلب گار تھا، اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا، اور اس کی آنکھیں جسم اسلام کے ہر ناسور پر اشک بار رہتی تھیں، اس نے مستقبل اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہو گئی۔

آج کل اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ کے ماخذوں پر طرح طرح کی خیال آرائیاں اور نکتہ آفرینیاں کی جا رہی ہیں، لیکن سید صاحب نے چند فقروں میں ان کی شاعری کے جو رموز و نکات بتائے ہیں وہی دراصل حقیقت ہے، سید صاحب رقمطراز ہیں:

"اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموز فطرت کا آشنا تھا، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا، یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔"

پھر آخر میں لکھتے ہیں:

"اقبال! ہندوستان کا فخر اقبال! اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال! فضل و کمال کا پیکر اقبال! حکمت و معرفت کا دانا اقبال! کاروان ملت کا رہنما اقبال! رخصت، رخصت، الوداع، الوداع، سلام اللہ علیک ورحمۃ الی یوم التلاق۔"

وجود باری

از جناب ڈاکٹر صفدر علی بیگ صاحب ایم اے پی ایچ ڈی استاد شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

آج سے کچھ عرصہ پہلے سائنسدانوں نے مادے کی تقسیم اور تجزیہ کرنا چاہا اور موشگاف آلات کے ذریعے سب سے چھوٹے اور باریک جز تک مادے کی تقسیم کی اور اس جز کو مالیکیول (Molecule) کا نام دیا گیا، کچھ عرصہ بعد مالیکیول کی بھی تقسیم ہوئی اور ایٹم (Atom) یعنی جوہر دریافت کیا گیا، عجیب و غریب آلات نے اس کے بھی ٹکڑے کر دیے اور اسکے اندر الکٹرونس (Electrons)، پروٹانس (Protons) اور نیوٹرانس (Neutrons) چکر کاٹتے نظر آئے، کچھ عرصہ بعد ان کا بھی تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر صرف توانائی یا انرجی (Energy) موجود ہے، اور یہی توانائی تمام مادی اشکال و صور اختیار کرتی ہے۔ عالم وجود کی ہر شے میں بلکہ موجودہ تحقیقات کی رو سے عدم جس کی ایتھر (Ether) اور ویکیوم (Vacuum) دو صورتیں ہیں، ان کے اندر بھی موجود ہے، غرض کوئی چیز توانائی سے خالی نہیں ہے، چاہے وجود ہو یا عدم۔

اب ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ توانائی بے جان ہے یا ذی حیات؟ اسکا جواب یہ ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک کسی کو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ نباتات میں بھی جان ہوتی ہے، ہندوستان کے ایک ماہر حیاتیات سر جگدیش چندر بوس نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا کہ نباتات بھی ذی حیات ہیں، بلکہ سائنسی تحقیقات نے یہ راز بھی فاش کر دیا ہے کہ پتھر میں بھی

جان ہوتی ہے، چنانچہ یورپ کے اکابر حکما کے نزدیک جمود بے جان کا کہیں وجود نہیں، خواہ وہ شجر و حجر ہوں یا حیوان و بشر، سب کے اندر کسی نہ کسی قسم کی زندگی موجود ہے، انگلستان کے دور حاضر کے سب سے بڑے فلسفی وائٹ ہیڈ کے نزدیک روح اور مادہ یا حیات و مادہ کی دوئی محض فریب ادراک ہے، اس نے پرزور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ہستی میں مادہ اور روح کی تقسیم جو عملی اغراض کے لیے کی گئی تھی، حقیقت میں بے معنی ہے، عموماً انسان جسے قالب سمجھتا ہے اس کی اصلیت بھی روح ہی ہے، مادہ دراصل ذی حیات ہے، قالب اور جان یا روح اور مادے کو دو الگ الگ اور متضاد چیزیں تصور کرنا علم کی ادنیٰ سطح پر تو ممکن ہے لیکن ماہیت وجود کو سمجھنے میں اس دوئی سے کوئی مدد نہیں ملتی، طبیعی حکما نے ذرے کے متعلق اب جو انکشافات کیے ہیں ان سے مادے کی ماہیت کے تصورات میں زبردست انقلاب آگیا ہے، اس انقلاب سے بہت سے جدید حکما کا رجحان اس طرف ہو گیا ہے کہ مادہ اور نفس کے جواہر میں اس قسم کی دوئی نہیں، جیسی گذشتہ صدی تک مادیین نے فرض کر رکھی تھی، مادے کی حقیقت روز بروز نفس کی حقیقت کی ہم ذات ہوتی جاتی ہے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جاندار شے میں کسی نہ کسی قسم کا احساس موجود ہوتا ہے، عارفوں اور حکیموں کا خیال ہے کہ احساس ہی نہیں بلکہ ادراک اور شعور بھی ہوتا ہے، بے شعور جمادات کا کہیں وجود نہیں، جدید حکما، اٹامک تھیوری کے پیش نظر شعوری جواہر کو تمام اشیا کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، مغرب کے بلند فکر فلسفی لائبنیز کا خیال تھا کہ کائنات بے جان و بے شعور نہیں بلکہ بلکہ ارواح پر مشتمل ہے، اس نے اپنی مابعد الطبیعیات کی بنیاد اس عقیدے پر رکھی تھی کہ کائنات مختلف المدارج ارواح پر مشتمل ہے جنھیں وہ موناڈس (موناد ات) کہتا تھا، اس کا خیال تھا کہ ان موناد ات کی قوتِ شعور میں بے انتہا تفاوت ہے، لیکن کوئی موناد مطلقاً بے شعور نہیں وائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ ہستی کے ہر پہلو میں احساس اور دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ربط وضبط

موجود ہے، ہر جگہ زندگی ہی زندگی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱:۶۱) — جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں،

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷:۴۴) — ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔

مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم بھی یہی ہے کہ کائنات میں کہیں جامد، بے جان اور بے شعور ہستی نہیں ہے، کیونکہ بے جان اور بے شعور ہستی کا ذکر و تسبیح کرنا عقلاً ممکن نہیں، اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا کسی شے کے شعور کو سمجھنے اور معلوم کرنے کے لیے کچھ مادی ذرائع یعنی آلات سے مدد لی جا سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہ تو ایسے آلات اس وقت موجود ہیں اور نہ شاید آئندہ پیدا کیے جا سکیں گے، انسانوں اور حیوانوں کے شعور کو اس طرح نہیں معلوم کیا جا سکتا، بلکہ عقل سلیم کے ذریعے سمجھا جاتا ہے، اس لیے نباتات اور جمادات کے شعور و احساس کو آلات کے ذریعے سمجھنے کا کوئی امکان نہیں ہے، البتہ عقل سلیم کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً نباتات کے شعور کو چند باتوں پر غور کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے، بیجوں کا جڑیں پیدا کرنا، اور ان کے ذریعے غذا فراہم کرنا، اس کا ادراک رکھنا کہ اگر غذا قریب میں موجود نہیں تو زمین میں کہیں نہ کہیں موجود ہے اور اپنی جڑوں کو دور دور تک پہنچانا، بعض درخت اپنی بقا کے لیے کانٹے پیدا کر لیتے ہیں، بعض پھلوں اور پتوں کی حفاظت کے لیے ان میں کڑواہٹ پیدا کر دیتے ہیں، اور یہ علم رکھتے ہیں کہ وہ اس طرح سے جانوروں سے محفوظ رہیں گے، ہر جاندار میں بقائے نسل اور افزائش نسل کی خواہش ہوتی ہے، یہی خواہش مکمل طور پر نباتات میں بھی پائی جاتی ہے، اپنی نسل پھیلانے کے لیے درختوں نے بیجوں کے انتشار

کے جو نت نئے طریقے اختیار کیے ہیں، ان سے عقل حیران ہو جاتی ہے، بعض درخت پھلوں میں بیج پیدا کرتے اور ان کو میٹھا اور لذیذ بنا دیتے ہیں، تاکہ انسان انھیں کھائیں اور جہاں بیج پھینک دیں وہاں ان بیجوں سے درخت اُگ آئیں، بعض پھلوں کے بیجوں میں سختی یا کڑواہٹ ہوتی ہے، تاکہ انھیں کھایا نہ جاسکے، ان کے کیمیائی اجزاء ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی شخص انھیں نگل جائے تو وہ ہضم نہیں ہوتے اور فضلے کے ذریعہ نکل جاتے ہیں، اور جس جگہ وہ گرتے ہیں وہاں درخت پیدا ہو جاتے ہیں، بعض درخت اپنے بیجوں میں نرم کانٹے پیدا کر دیتے ہیں، جو پاؤں اور جانوروں کی دم میں لپٹ جاتے ہیں اور جہاں گرتے ہیں وہاں درخت پیدا ہو جاتے ہیں، بعض درختوں کے پھل سوکھ کر زور سے پھوٹتے ہیں اور بیج منتشر ہو جاتے ہیں، بعض کے بیج اتنے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں کہ ہواؤں سے اڑ جاتے اور جہاں گرتے ہیں درخت پیدا کر دیتے ہیں، غرض درختوں نے بیجوں کے انتشار کے بے شمار طریقے اختیار کیے ہیں، یہ سب بغیر شعور کے کیسے ممکن ہے؟ پھر بقا اور افزائش نسل کا خیال اور خواہش ان میں کیسے پیدا ہو گئی، آج کل ماہرین نباتات کا خیال ہے کہ بعض خاص قسم کی موسیقی سے پودوں کی نشوونما بڑھ جاتی ہے، اگر شعور نہیں تو موسیقی کیسے اثر کرتی ہے؟

اگر کائنات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پردۂ وجود پر گوناگوں اور بوقلموں تصویریں اور مرقعۂ فطرت کا جمال کسی مصور کی قدرت و کمال کا آئینہ دار ہے، ازل سے ابد تک عمل تخلیق کا تسلسل اور صناعی کا کمال کسی مخفی حسن کار ذہن یا فن کار دماغ کو ظاہر کرتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مصور کو اعلیٰ درجہ کی تصویر بنانے میں کس قدر دماغ سوزی اور کد و کاوش کرنی پڑتی ہے، جب فن کار دماغ کے بغیر صفحۂ قرطاس پر خوبصورت نقش نہیں بن سکتے تو صفحۂ ہستی پر اس قدر خوشنما نقوش کی نمود، رنگین و دلکش پھولوں، سرسبز درختوں اور خوشنما پرندوں مچھلیوں، سیپیوں اور پتھروں (بمبئی کے تاراپور والا ایکویریم کی مچھلیوں اور ہنگاور کے

میوزیم کی سیپیوں اور پتھروں کے رنگا رنگ خوشنما نقوش دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے) جانوروں اور انسانوں کا جاذبِ نظر روپ ایک فن کار دماغ کے بغیر کیسے ممکن ہے، اور بغیر کسی غور و فکر کے اس قدر باقاعدگی، تناسب و توازن اور تہذیب و تنظیم کا خود بخود پیدا ہو جانا خلافِ عقل ہے۔ اگر یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہو رہا ہے تو اس کا بے ربط و نظام ہونا ضروری تھا،

سیاروں کا نظام دیکھئے، جن کی باقاعدگی اور تنظیم کے فہم و ادراک سے ماہرین فلکیات کا ذہن رسا بھی عاجز ہے، آسمان تو ایک بحر بے پایاں ہے، خود انسان کی چھوٹی سی ہستی ایک چیستاں ہے، زمین و آسمان کے قلابے ملانے والی اور ستاروں پر کمند ڈالنے والی عقل و نظر اس میں کیسے پیدا ہو گئی؟ اس کی عقل و دانش سے قطع نظر اگر جسم ہی کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تمام اعضاء و جوارح کی ساخت، ان کے تناسب اور ان کے اعمال و وظائف کی تخصیص کس نے کی؟ غیر شعوری طور پر تقسیم کار کس طرح ممکن ہے؟ اس قسم کی بے شمار باتوں پر غور کیا جائے تو کسی چھپے ہوئے غور و فکر کرنے والے ذہن و دماغ کا وجود ناگزیر معلوم ہوتا ہے، اسی لیے حکمائے مشرق و مغرب کا خیال ہے کہ پردۂ وجود کے اندر کوئی کار فرما ذہن ضرور موجود ہے، جو وجود و عدم دونوں حالتوں میں کار فرما ہے،

اوپر یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ توانائی عالم وجود اور کتم عدم دونوں میں موجود اور کار فرما ہے، پھر یہ سوال اٹھا کہ وہ بے جان ہے یا ذی حیات؟ دور جدید کے حکما کا خیال ہے کہ بے جان و بے شعور جمادات کا وجود ممکن نہیں، اس لیے توانائی کا بھی بے جان و بے شعور ہونا ناممکن ہے، کسی ذی حیات کے بارے میں یہ تصور کہ وہ بڑھتی گھٹتی ہے، غذا اور سانس لیتی ہے، اور اولاد پیدا کرتی ہے، بہت محدود تصور ہے، قرآن حکیم نے خدا کو "حیّ" یعنی زندہ بتایا ہے، لیکن ان معنوں میں اور زندگی کی ان صفات کے ساتھ خدا کو زندہ کہنا انتہائی لغو اور مہمل بات ہوگی، خدا زندگی کی خصوصیات

کے بغیر بھی حی ہے، اس لیے اگر توانائی بھی ان خصوصیات کی حامل نہ ہو تو اس کے زندہ ہونے پر کیوں شک کیا جائے، توانائی اگرچہ مادی اشکال و صور اختیار کرتی ہے مگر خود مادے کی تعریف میں نہیں آتی، وہ نہ نظر آتی ہے اور نہ محسوس ہوتی ہے، اور جس طرح انسان کے بھیجے میں دماغ (مائنڈ) موجود رہتا اور انسانی جسم اور اعضا کو حرکت میں لاتا ہے، اور مادے کی تعریف میں نہیں آتا، اسی طرح وہ مائنڈ جو عالم وجود میں موجود اور عمل پیرا ہے، مادے کی تعریف میں نہیں آتا، اسی کو خدا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے،

چنانچہ مشرق و مغرب کے بیشتر حکما، اور صوفیاے کرام نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وجودِ خداوندی ہر شے کی اصل، ہر شے پر محیط اور ہر شے میں ساری ہے، وہ تمام کائنات کے اندر اور اس کے باہر ہر جگہ موجود ہے، تمام مظاہر میں اسی کا ظہور ہے، وہی کائنات کی تمام اشکال میں جلوہ گر ہے، کلام مجید کی آیات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے،

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (۵۷ : ۳) — اللہ ہی اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے۔

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (۲:۱۱۵) — جہاں کہیں رخ کر لو وہیں خدا کا سامنا ہے۔

وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطًا (۴:۱۲۶) — خدا ہی سب چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

پہلی آیت میں "ھو الظاہر" سے صوفیہ مراد لیتے ہیں کہ جو کچھ ظاہر ہے یعنی عالم وجود کی صورت میں ہے، وہ خدا ہی کے وجود کی نمایش ہے، دوسری آیت کو اس خیال کی تائید میں پیش کرتے ہیں کہ کائنات مادی میں اللہ تعالیٰ ہر طرف بالذات موجود ہے، تیسری آیت سے اللہ تعالیٰ کی احاطتِ ذاتی مراد لیتے ہیں، حق تعالیٰ کے قرب ذاتی کی طرف بھی چند آیات میں اشارہ کیا گیا ہے،

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ (۲ : ۱۸۶) — جب میرے بندے میرا حال تم سے پوچھیں تو کہدو کہ میں ان کے قریب ہی ہوں،

وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (۵۰ : ۱۶) — ہم تو اس کی (انسان کی) شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

ان آیات سے صوفیہ حق تعالیٰ کا قرب ذاتی مراد لیتے ہیں، علم کے ذریعہ نہیں کیونکہ کسی شے کا محض مکمل علم رکھنا اس سے قربت نہیں کہلا سکتا،

صوفیہ کا خیال ہے کہ حق تعالیٰ نے جب اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا تو کائنات نمودار ہوئی یعنی اسی کی "وحدت" نے اپنے آپ کو عالم کثرت کی صورت میں ظاہر کیا، "وحدت" حق تعالیٰ کی اور "کثرت" کائنات کی صفت ہے، لیکن وحدت ہی کثرت کی شیرازہ بند ہے، کثرت عیاں اور وحدت نہاں ہے، وحدت حقیقت اور کثرت اس کے شیون ہیں، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی نگاہ میں یہ عالم کثرت کیوں نمایاں ہے؟ اس کی نظر امتیازات اور تعینات میں کیوں گم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نظر محدود اور عقل محصور ہے، در اصل کثرت اعتبار نظر ہے اور تعینات عقل کے حدود کا نتیجہ ہیں، اس لیے عقل اور نظر کثرت کو دیکھتی اور وحدت تک نہیں پہنچتی، اس کے لیے ظاہر تو بے نقاب ہے لیکن باطن پر حجاب ہے، جس طرح ہر شے میں توانائی موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آتی، کیونکہ ہر شے ظاہر میں مادہ اور حقیقت میں توانائی ہے، اسی طرح عالم کثرت کی حقیقت وحدت اور وحدت کا ظاہری روپ کثرت ہے، کثرت میں وحدت کو سمجھاتے ہوئے امام غزالی کہتے ہیں کہ بعض چیزیں کسی خاص مشاہدے سے دیکھو تو بہت ہیں اور کسی اور اعتبار سے دیکھو تو واحد ہیں، مثلاً انسان کے اعضا تو بہت ہیں، مگر انسان واحد ہے، انسان کی مثال اگرچہ بالکل مطابق نہیں ہے پھر بھی

اس سے ظاہر ہے یں کثرت کے واحد ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

عقل اور نظر دونوں زمان و مکان میں اسیر ہیں، ماورائے زمان و مکان نہ نظر دیکھتی نہ عقل سوچتی ہے، زمان و مکان کا تصور در اصل عقل و نظر کے حدود کا نتیجہ ہے، قرآن حکیم کی آیت هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ اس محدود عقل و نظر پر ایک ضرب ہے، کیونکہ حقیقتاً جو اول ہے وہ آخر نہیں ہوسکتا اور جو آخر ہے وہ اول نہیں ہوسکتا، اسی طرح نہ ظاہر باطن ہوسکتا ہے، نہ باطن ظاہر کہلاسکتا ہے، کیونکہ جو سفید ہے وہ سیاہ، جو سیاہ ہے وہ سفید، جو بلند ہے وہ پست اور جو پست ہے وہ بلند نہیں کہلاسکتا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف اول، آخر، باطن، ظاہر کیوں بیان کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل محدود کو اس کے حدود کے لحاظ سے ہی خدا کی لامحدودیت سمجھانا تھا اور ان تعینات میں تضاد ہونے کے باوجود ان میں ایک وحدت ظاہر کرنا تھا، جس طرح اس تضاد میں ایک وحدت ماننا پڑتی ہے، اسی طرح اس عالم کثرت میں بھی اگرچہ مختلف اور متضاد اشیاء موجود ہیں، پھر بھی ان میں ایک وحدت ماننا پڑے گی اور یہ وحدت حق تعالیٰ ہی کی ہوگی،

لیکن صوفیہ کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ کائنات ہستی کی حقیقت و حیثیت خدا سے الگ اور غیر حق ہے، اس کو خدا کی ذات میں شریک کرنا شرک ہے، جو محض غلط فہمی ہے، کیونکہ کائنات کو الگ حقیقت اور علیحدہ وجود مان کر اس کو خدا کی ذات میں شریک نہیں کیا جاتا، بلکہ اسکے الگ وجود ہی کو تسلیم نہیں کیا جاتا، یعنی وجود صرف ذات حق کا ہے، اس سے ہٹ کر اور کوئی وجود نہیں، ایسی صورت میں شرک کا سوال نہیں پیدا ہوتا،

شرک کو سمجھاتے ہوئے چوتھی صدی ہجری کے مشہور صوفی شیخ ابوالحسن علی ہجویری کہتے ہیں:

"توحید خدا کی طرف سے بندے پر اسرار ہے، اور توحید کے اثبات میں کسی دوسرے وجود کو

ثابت کرنا خود شرک ہے۔" یعنی کائنات کا وجود حق تعالیٰ کا غیر نہیں ہے، اگر اس کو غیر حق اور مستقل وجود ثابت کیا جائے تو دو الگ الگ مستقل وجود ثابت ہوں گے اور کائنات اپنے مستقل اور حقیقی وجود میں اللہ تعالیٰ کی شریک ہوجائے گی، جو سراسر شرک ہے، اس لیے امام غزالی نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو شے قائم بالذات نہیں بلکہ قائم بالغیر ہو اس کا وجود حقیقی نہیں کیونکہ اس کا وجود دوسرے پر منحصر ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حقیقت میں سوائے ذات حی قیوم بے ہمتا کے اور کسی کا وجود حقیقی نہیں، وہی اپنی ذات سے قائم ہے، اس کے علاوہ سارے وجود اسی سے قائم ہیں، اسی لیے جن کی بصیرت قوی ہے وہ سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں دیکھتے، ان کے نزدیک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کو بھی موجود ثابت کرتے ہیں، وہ مشرک ہیں، حضرت بایزید بسطامیؒ کے ایک مرید نے کہا کہ ایک وقت ایسا تھا کہ صرف خدا کا وجود تھا، اس کے سوا کوئی موجود نہ تھا، یہ سنکر بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ "اب بھی صرف خدا ہی موجود ہے۔" یعنی کسی اور کا وجود ثابت نہیں۔

حضرت تاج کی نعتیہ شاعری

از جناب سید منظور الحسن صاحب برکاتی فاضل دار العلوم خلیلیہ ٹونک

اصناف شاعری میں "صنف نعت گوئی" ایک سخت اور دشوار ترین صنف سخن تسلیم کی گئی ہے، اس صنف پر طبع آزمائی کرنے والے شعرا نے ہمیشہ اس راہ کی مشکلات کا اعتراف کیا ہے اور اس کے حق سے عہدہ برآ ہونے میں اپنی دماغی و قلمی تمام توانائیوں کے صرف کرنے کے بعد بھی یہی کہا ہے ؎

لا یمکن الثناء کما کان حقہ　　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عرفی جیسے بلند خیال، قادر الکلام شاعر نے جب اس راہ میں قدم رکھا اور اس راہ کی دشواریوں کو مشاہدہ کیا تو بے ساختہ اس کی زبان و قلم سے نکلا ؎

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است　　　آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی کسی معزز و اہم شخصیت کی تعریف و توصیف میں شاعرانہ محاسن کے ساتھ اشعار کا موزوں کر لینا اور مبالغہ آمیز قصائد کہہ دینا تو کوئی مشکل اور دشوار کام نہیں ہے، لیکن نعت سرور کائنات لکھنا ممدوح خدا، محبوب رب العلمین، خاتم النبیین، افضل البشر اور صاحب لولاک لما صلی اللہ علیہ وسلم کی ارفع و اعلیٰ شان میں لب کشائی کرنے اور زبان و قلم کو حرکت میں لانے کے لیے شاعرانہ مہارت و کمال کے ساتھ ادب و احترام، خلوص و عقیدت، احساس عظمت و رفعت حدود شناسی و مرتبہ دانی کی بھی بڑی شدید ضرورت ہے،

کیونکہ یہ وہ مقدس بارگاہ ہے جہاں جلیل القدر ملائکہ بھی لرزہ براندام نظر آتے ہیں۔

حضور سرور کائنات، فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع کمال و صفات، برگزیدہ و مقدس ہستی کے اوصاف و محامد کا بیان، آپ کے اخلاق حمیدہ، شمائل و محاسن کا تذکرہ، نبوت کے حقیقی کمالات کی تصویر کشی، پھر خدا کے ساتھ آپ کا قرب خاص اور مراتب عالیہ کا ذکر، اور اس ذکر میں الوہیت و نبوت کے حدود کا لحاظ، خدا اور اس کے پیارے رسول و حبیب کے مدارج میں فرق و امتیاز، ان سب باتوں کے لیے قدرت بیان اور شاعرانہ کمال کے ساتھ فطرت صالحہ، صحیح اسلامی تصورات سے واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی دینی و مذہبی معلومات و بصیرت درکار ہے، یہاں بغیر احساس عظمت و رفعت اور بلا واقفیت حدود شریعت، محبت و عقیدت کا اظہار کرنا، ایک قسم کی جرأت رندانہ و دیوانگی ہے، اور بارگاہ سید کونین میں ایسی دیوانگی ناقابل معافی ہے۔

وہی شاعر اس وادی کو کامیابی اور سلامتی سے طے کر جاتا ہے، جو شاعرانہ نزاکتوں پر قدرت رکھتے ہوئے

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

کے اصول کو ملحوظ رکھے اور اپنے جذبات محبت و عقیدت کو بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کرنے میں نزل ادب شناسی سے سر مو تجاوز نہ کرے۔

بابائے اردو مولانا عبد الحق، مولانا حالی کی نعت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"نعت میں وہی ذکر ہونا چاہیے جو خدا کے نبی کے لیے شایان ہے اور جس کے پڑھنے اور سننے سے لوگوں پر روحانی اور اخلاقی اثر پڑے اور معلوم ہو کہ "کمال بشریت" اسے کہتے ہیں"۔

حضرت والی آسی مقدمۂ ارمغان نعت میں رقم طراز ہیں کہ

"محبت نبوی اور عشق محمدی کا پاک ولولہ اور مخلصانہ ذوق وشوق زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے، اور اس متاع کی حفاظت جان زندگی اور اس کے اظہار کے لیے ادب کی شرط حقیقی شرط کیونکہ آپ کا ادب ہی ایمان واسلام ہے اور اس سے محرومی کفر، اس ادب کی حقیقت کو سمجھنے کیلئے قرآن پاک پر نظر ڈالنا ضروری ہے، قرآن حکیم میں تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر جہاں کہیں کیا ہے، وہاں ان سب کو ناموں سے پکارا گیا ہے اور ان کے واقعات کا ذکر بھی ان کے ناموں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن ذات مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں کہیں صرف "عبد" اور کہیں صرف "عبداللہ"۔ اور اسی طرح جب رب کائنات نے آپ کو پکارا تو یا آدم، یا زکریا، یا یحییٰ، یا موسیٰ، یا عیسیٰ یا الیاس کی طرح یا محمد نہیں پکارا، بلکہ کبھی صدائے عزت یا ایہا الرسل، اور کبھی طرز محبت یا ایہا المزمل، یا ایہا المدثر سے پکارا ہے، اور اپنے بندوں کو "تعزروہ وتوقروہ" (اس کی عزت کرو اسکی توقیر بجالاؤ) کا حکم دے کر آپ کی عظمتوں کی انتہا بتلادی، اور یہ معلوم ہوتے ہی عرفی شیرازی کی زبان میں کہنا پڑا ۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است (ص ۱۸ و ۱۵)

اس معیار اور کسوٹی پر اگر شعرائے نعت گو کے کلام کو کسا اور پرکھا جائے تو صرف چند نعت نگار ایسے ملیں گے جو اس معیار پر پورے اتریں گے۔

یہاں ہم ایک ایسے نعت گو، مداح رسول، عاشق نبی اور غلام غلامان آل محمد کی نسبت پر فخر کرنے والے شاعر کے نعتیہ کلام پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں جس کی نعتیں اپنے تمام محاسن ولوازم کے ساتھ مثالی ہیں، اور جو خود ایک ریاست کا تاجدار اور حکمراں رہا ہے، لیکن

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

وہ تاجداروں کے تاجدار اور شاہنشاہوں کے شاہنشاہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ درباری اور خادم بننے میں دین و دنیا کی سعادت و فلاح سمجھتا ہے۔ اور اس اعلیٰ خدمت پر اس قدر نازاں، اتنا مسرور اور اس درجہ بے نیاز ہے کہ سلطنت قیصر وجم بھی اس کے نزدیک بے حقیقت چیز بن گئی ہے، چنانچہ وہ خود کہتا ہے ۔

اپنی ٹھوکر میں ہے اب سلطنت قیصر وجم
مل گئی خدمت دربار رسالت ہم کو

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی:

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب	تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا
الیہ من والدہ وولدہ والناس	جب تک کہ اسکو اپنے ماں باپ سے اور
اجمعین (رواہ بخاری ومسلم)	سب لوگوں سے زیادہ میری محبت نہ ہو۔

کے تقاضا اور مطالبہ کی تکمیل وتعمیل میں سرکار دو عالم، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کو جان ومال، عزت وآبرو، وقار وتمکنت، اعزا واقارب حتیٰ کہ ماں باپ تک سے زیادہ محبوب رکھتا ہے، اور عشق نبی ومحبت رسول کو اپنے ہی لیے نہیں، ہر قلب حزیں کے لیے باعث تسکین وراحت اور موجب طمانیت سمجھتا ہے ۔

آپ کا عشق تسلی دہ ہر قلب حزیں
نور بخش نظر دیدۂ مشتاق ہیں آپ

وہ انجمن عشق کے تنہائیاں ہی نہیں
جو دل سے نہ ہو شیفتۂ ذات محمد

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ماہ مبارک جب طلوع ہوتا ہے تو اس کے ایوان ریاست میں جشن ومسرت کا پیغام لیکر آتا ہے، اور اس کے دل ودماغ پر سرور وکیف کا عالم طاری ہوجاتا ہے وہ اس بہار وبہجت اور فضل وبرکت کے مہینہ میں خصوصیت کے ساتھ ذکر رسول

اور مدحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متبرک محافل و مقدس مجالس کا بڑی عقیدت و محبت اور خلوص و احترام سے اہتمام و انصرام کرتا ہے، اور اس جذبہ کی سرشاری و مستی میں بے اختیارانہ پکار اٹھتا ہے

مری دولت مری جاں محفلِ میلاد پر قرباں   یہ وہ محفل ہے جس کی رونقِ محفل محمدؐ ہیں

اس سے میری مراد ٹونک کے ساتویں اور آخری فرمانروا اعلیٰ حضرت نواب اسمٰعیل علی خاں بہادر تاج بالقابہ کی ذاتِ گرامی ہے،

حضرت تاج رئیس ابن رئیس ہونے کے ساتھ شاعر ابن شاعر بھی ہیں اور ناعت ابن ناعت بھی، ریاست و امارت کے ساتھ شاعری اور بالخصوص مدحتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذوق و جذبہ آپ کو وراثت میں ملا ہے،

آپ کے پدر بزرگوار خلد آشیاں امین الدولہ نواب ابراہیم علی خاں بہادر خلیلؔ باحشمت رئیس و حکمراں ہونے کے ساتھ اعلیٰ پایہ کے نغز گو شاعر اور مداحِ رسول بھی تھے، حمد و نعت کا ایک وافر ذخیرہ آپ کی یادگار ہے، جو اپنے زورِ بیان، شوکتِ الفاظ اور پُرعظمت ترکیب کے اعتبار سے ادب العالیہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے ہر ہر لفظ سے عشق نبی اور شیفتگی رسول کا جذبہ نمایاں ہے،

حضرت خلیلؔ کا جذبۂ حبِ رسول ان کی اولاد اور ان کے صاحبزادگان میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان میں جناب تاجؔ سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں ہیں،

آپ چونکہ خود بھی ایک مایۂ ناز اور قادر الکلام شاعر ہیں، اس لیے اپنے عشق نبی اور محبت رسول کے پُرخلوص و پُرسوز جذبہ کو نظم و شعر کے قالب میں ایسے مؤثر انداز میں ڈھالا ہے کہ سننے والا اور پڑھنے والا بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔

آپ کے نعتیہ کلام میں عقیدت و احترام کا جو جوش و جذبہ پایا جاتا ہے، وہ آپکے دل کی آواز ہے

حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی ذاتِ ستودہ صفات سے آپ کو جو خلوص، جتنی حسن عقیدت اور جو عشق ہے، اس کا اندازہ اور مشاہدہ آپ کی منعقد کردہ محافل میلاد اور مجالس ذکر رسول میں ہوتا ہے۔ ان گنہگار آنکھوں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ ذکر رسول کے وقت حضرت تاج کی آنکھیں اشکبار رہتی ہیں، اور جب تک یہ مقدس مجالس جاری رہتی ہیں حضرت تاج آنسوؤں کے در شہسوار بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کرتے رہتے ہیں، ان کا دامن اور رومال آنسوؤں سے تر ہو جاتا ہے، وہ انتہائی ادب و احترام سے دوزانو نشست فرما ہوتے ہیں، اور سراپا عجز، سراپا انکسار، سراپا نیاز، سراپا ذوق، سراپا شوق، ہمہ تن گوش، ہمہ تن سوز، پیکرِ تہذیب، مرقع تادیب اور مجسمۂ اخلاص و عقیدت کی صورت میں سیرت مقدسہ کا بیان سماعت فرماتے ہیں،

قاضی عیاض "شفا" میں فرماتے ہیں کہ جب آپ کا ذکر شریف کسی موقع پر ہو تو اہلِ ایمان پر اس ذکر پاک کی تعظیم و تکریم اسی طرح واجب ہے، جیسے خود آپ کی تعظیم و تکریم حالتِ حیاتِ مبارکہ میں کیجاتی تھی۔

یہ ہمارا عقیدہ و ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ثمرہ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ آخرت میں جو ثمرہ ملے گا وہ اتنا ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس سے بڑھ کر کونین میں اور کوئی ثمرہ ہو ہی نہیں سکتا۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حضور انورؐ اپنے روبرو منبر پر کھڑا کرتے، اور ان کیلئے دعا فرماتے کہ اللھم ایدہ بروح القدس، وہ تو خیر جلیل القدر صحابی تھے، کعب بن زہیر جو اپنی شاعرانہ گستاخیوں کے جرم میں واجب القتل قرار دیے جاچکے تھے، جب دربار نبویؐ میں دفعۃً معذرت خواہ ہو کر حاضر ہوئے، اور اپنا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" شروع کیا اور

یہ شعر پڑھا:

ان الرسول لنور یستضاء بہ   مھند من سیوف اللہ مسلول

بے شک اللہ کے نبی ایک ایسا نور ہیں کہ جن کی ذات سے کائنات روشنی حاصل کرتی ہے، اور وہ خدا کی ایک برہنہ تلوار ہیں جس نے بیدینی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینک دیا ہے۔

تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر اپنی ردائے مبارک اتار کر ان کو مرحمت فرمادی،

صاحب قصیدۂ بردہ نے فالج میں مبتلا ہونے کے بعد جب قصیدہ تحریر کیا، تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں ان کے پاس تشریف لائے اور اپنا دستِ مبارک ان کے بدن پر پھیرا، اس کی برکت سے ان کو شفا ہو گئی۔

حضرت تاج کو اس دنیا میں جو اعزاز و وقار حاصل ہے، وہ بھی اسی محبت کا ثمرہ ہے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

تاج پر جب آپ کے الطاف کا سایہ پڑا   زور دوراں کا نہ کچھ بھی اس کے آگے چل سکا
آپ کے صدقے میں تاج و تخت کا مالک بنا   یہ سعادت بھی میسر ہو شہِ ہر دوسرا
حاضر دربار ہو یہ تاج با شوقِ تمام   اور پڑھے باچشمِ پُرنم الصلوٰۃ والسلام

اور آخرت کے لیے ان کو امید وار رہنا چاہیے کہ انشاء اللہ معیت رحمۃ للعالمین اور رفاقت شفیع المذنبین جیسا گرانقدر اور اعلیٰ ثمرہ انھیں حاصل ہوگا، جس کی بشارت حضرت انس ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت سے ملتی ہے، جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے:

حضرت انس ابن مالک سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے لیے بھلا تو نے کیا سامان تیار کیا ہے،

اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے، نہ بہت سی نمازوں کا توشہ ہے نہ روزوں کا، نہ صدقہ کا، ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میرے دل میں ہے، یہ سنکر آپ نے فرمایا

انت مع من احببت   پھر قیامت میں تو ان ہی کے ساتھ ہوگا جن سے تجھے محبت ہے

صاحب ترجمان السنۃ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ آخری جملہ انت مع من احببت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی موقعوں پر ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ جب صحابہ نے ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا تھا جو کسی جماعت سے محبت تو رکھتا ہے، مگر اس کے جیسے عمل نہیں کر سکا، آپ نے ان کے جواب میں بھی فرمایا المرء مع من احبّ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخروی آئین میں محبت کا صلہ معیت ہے، اور ایک عاشق کی منتہائے تمنا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے، اسی لیے بعض روایات میں حدیث مذکور کے آخر میں ہے، "قال انس فما رأیت المسلمین فرحوا بشیء بعد الاسلام فرحھم بھا" انس فرماتے ہیں کہ میں نے اسلام کے بعد صحابہ کو اتنا خوش ہوتے ہوئے کسی بات پر نہیں دیکھا جتنا کہ اس خوشخبری پر۔

یہ خوشخبری ہر محب رسول، عاشق نبی اور مداح محبوب رب العالمین کے لیے آج بھی بہت بڑی خوشخبری ہے، قیامت کے دن معیت رسول اور رفاقت شفیع المذنبین سے بڑھ کر اور کونسی نعمت ہو سکتی ہے، اس انعام خداوندی پر جس قدر بھی ایک مداح رسول اور ثناخوانِ مصطفےٰ وجد و فخر کرے بجا ہے۔

ان ہی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت میں اس کی تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من احبنی کان معی فی الجنۃ" جو کوئی مجھے محبت رکھتا ہے وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

حضرت تاج کی ذاتِ رسالت مآبؐ سے محبت وعقیدت اور ذکر رسول وثنائے نبی سے شیفتگی ان کی نعتیہ شاعری کا سرمایہ ہے وہ انشاء اللہ ان کے لیے بخشش کا ذریعہ ہوگا،

قیامت کے دن جب وہ بارگاہ رسالت مآب میں اپنی بشری کمزوریوں، خطاؤں اور لغزشوں پر ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے عرض کریں گے ؎

یہ حاضر ہوا ہے بصد انکساری ذرا کیجیے اس کی کچھ پردہ داری

نہ ہو حشر میں اس کی کچھ بے وقاری ہے تاج آپ کا امتی یا محمدؐ

ز سر تا بپا رحمتی یا محمدؐ

نظر جانب ہر گنہگار داری

تو انشاء اللہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی رافت ومحبت اپنے آغوش میں لے لیگی، اور جب وہ محبوب رب العالمین کے ظلِ شفاعت میں کھڑے ہوکر بارگاہ رب جلیل میں بزبان خلیل عرض رسا ہوں گے ؎

کوئی ہے زہد پہ نازاں کوئی عبادت پر یہاں تو لے مرے آمرزگار کچھ بھی نہیں

ترے کرم کا الٰہی مرے گناہوں کا حساب کچھ بھی نہیں، شمار کچھ بھی نہیں

خدا کا رحم ہے بخشش کے واسطے درکار سوائے فضل خداوندگار کچھ بھی نہیں

تو اس کی رحمت ومغفرت کی بارش سارے گناہوں کو دھو دے گی۔

حضرت تاج کی نعت گوئی کے اس پس منظر، ذکر رسول سے آپ کی شیفتگی، ذاتِ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی سچی اور پرخلوص عقیدت ومحبت اور اس کے ثمرات کے تذکرے کے بعد احادیث نبوی کی روشنی میں ان کے نعتیہ کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم، جب تک تو مجھ سے گناہوں کی بخشش مانگتا رہے گا اور مجھ سے امید رکھے گا، میں تجھ کو بخشوں گا، تو نے جو بھی برا کام کیا ہوگا مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی، یعنی تو چاہے کتنا ہی بڑا گنہگار ہو، تجھے بخشنا میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے —— اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک بھی پہنچ جائیں اور تو مجھ سے بخشش چاہو تو میں تجھ کو بخش دوں گا، اور مجھے اس کی پرواہ بھی نہیں ہوگی۔ اے ابن آدم! اگر تو مجھ سے اس حال میں ملے کہ تیرے ساتھ گناہوں سے بھری ہوئی زمین ہو تو میں تیرے پاس بخشش ومغفرت سے بھری ہوئی زمین لیکر آؤں گا، بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو۔ یعنی شرک میں مبتلا نہ ہوا ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس شخص نے یہ جانا کہ میں گناہوں کو بخشنے پر قادر ہوں تو میں اسے بخشدوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی۔ بشرطیکہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بندہ کا اس بات کو جاننا کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی مغفرت پر قادر ہے، اس کی مغفرت وبخشش کا سبب ہے، کیونکہ جو شخص یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی بخشش پر قدرت رکھتا ہے، وہ اس سے امید رکھتا ہے اور جو شخص کریم سے امید رکھتا ہے، کریم اسے محروم نہیں رکھتا، ایک اور حدیث قدسی ہے کہ

انا عند ظن عبدی بی میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا احادیث کو پڑھیے اور پھر حضرت تاج کی مناجات کے یہ بند پڑھیے:

اے خدا تو ہی مرا معبود ہے — اے خدا تو ہی مرا مسجود ہے

اے خدا تو ہی مرا مقصود ہے — میں ہی حامد تو مرا محمود ہے

بادشاہا جرم مارا درگزار

ما گنہگاریم تو آمرزگار

دافعِ امراض روحانی ہے تو — دافعِ حزن و پریشانی ہے تو

دافعِ رنج وگراں جانی ہے تو — واقفِ اسرارِ پنہانی ہے تو

بادشاہا جرم مارا درگذار

ما گنہگاریم تو آمرزگار

باوجود اس کے کہ ہے تو بے نیاز — اپنے بندوں کا ہے تو ہی چارہ ساز

جانتا ہے تو مرے سربستہ راز — ہے تو ہی میرا کفیل و کارساز

بادشاہا جرم مارا درگذار

ما گنہگاریم تو آمرزگار

قیامت کے ہولناک دن محشر میں پیش آنے والے جن واقعات کی اطلاع احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں وضاحت کے ساتھ دی گئی ہے، اور جن پر ایک مومن کو ایمان لانا اور یقین کرنا ضروری ہے، ان میں سے ایک سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت بھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کئی قسم کی ہوگی اور بار بار ہوگی، سب سے پہلے جبکہ سارے اہل محشر خداوند ذوالجلال کے جلال سے سراسیمہ اور خوفزدہ ہوں گے اور کسی کو لب ہلانے کی جرأت و ہمت نہ ہوگی اور حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر بھی "نفسی نفسی" کے عالم میں ہوں گے، اور کسی کے لیے

شفاعت کی جرأت نہ کرسکیں گے، تو اس وقت عام اہل محشر کی درخواست پر اور انکی پریشانی و تکلیف سے متاثر ہو کر شفیع المذنبین، محبوب رب العلمین صلی اللہ علیہ وسلم ہمت کر کے اللہ کے لطف و کرم پر اعتماد کر کے آگے بڑھیں گے اور پوری نیازمندی اور حسن ادب کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں اہل محشر کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ آیت تلاوت فرمائی:

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِىْ فَاِنَّهٗ مِنِّىْ

یعنی اے میرے پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے (یعنی انکی وجہ سے بہت آدمی گمراہ ہوئے) پس جو لوگ میری پیروی کریں وہی میرے ہیں۔ پس ان کے لیے تو میں تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ تو انکو بخش دے

اور عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی تلاوت فرمایا جو قرآن پاک میں ہے

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ

اے اللہ اگر آپ میری امت کے ان لوگوں کو عذاب دیں تو یہ آپکے بندے ہیں، (یعنی عذاب و سزا کا آپ کو پورا حق ہے)

یہ دونوں آیتیں تلاوت فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یاد کیا اور دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور کہا، اے میرے اللہ، میری امت، میری امت، اور اس دعا میں روئے، اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو فرمایا تم محمد کے پاس جاؤ، اور اگرچہ تمہارا رب سب کچھ خوب جانتا ہے، پھر بھی تم جا کر ہماری طرف سے پوچھو کہ ان کے اس رونے کا کیا سبب ہے، پس جبرئیلؑ

آپ کے پاس آئے اور آپ سے پوچھا، آپ نے جبرئیل کو وہ بتلادیا جو اللہ سے عرض کیا تھا، یعنی اس وقت میرے رونے کا سبب امت کی فکر ہے، جبرئیلؑ نے جاکر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا، تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو فرمایا کہ محمد کے پاس جاؤ اور ان کو ہماری طرف سے کہو کہ تمھاری امت کے بارے میں ہم تمھیں راضی اور خوش کر دیں گے اور تمھیں رنجیدہ و غمگین نہیں کرینگے۔" (مسلم)

مذکورہ بالا حدیث کو سامنے رکھکر حضرت تاج کے حسب ذیل اشعار پڑھیے ؎

صرف امت کی شفاعت کا ہو جذبہ دل میں   اللہ اللہ رے ارمانِ رسولِ عربی

نظرِ ربِ غفور تاج کے پیارے رسول   شافعِ یوم النشور تاج کے پیارے رسول

ایک گنہگار بھی مایوس و ہراساں نہ رہے   عرصۂ حشر میں ہونگے نگراں میرے نبی

اے راحتِ روحِ دو جہاں، اے داروئے دردِ نہاں   اے حامئ دل خستگاں، اے شافعِ کل مذنبیں

ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ میں ہے کہ "حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے حق میں ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوں گے۔"

یہ حدیث بھی خطاکارانِ امت اور اہل معاصی کے لیے اپنے اندر بڑی زبردست بشارت رکھتی ہے، اور حضرت تاج کے حسب ذیل اشعار کی تائید کرتی ہے ؎

زہرِ عصیاں کا اثر اب شفاعت سے گیا   ہر گنہگار یہ کہتا ہے کہ تریاق ہیں آپ

رنج سے کیوں رہیں رنجور   جب طبیب و شفا ہے ذاتِ رسولؐ

دوائے دلِ بیکساں ہیں محمدؐ   علاجِ غمِ عاصیاں ہیں محمدؐ

محمدؐ ہیں شفیعِ روزِ محشر   طبیبِ دردِ روحانی محمدؐ

مندرجہ بالا سطور میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں حضرت تاج کے نعتیہ کلام

کی جو وضاحت و صراحت کی گئی ہے، اس سے جہاں ایک طرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی نعتیہ شاعری کس درجہ احادیث نبوی سے مناسبت رکھتی ہے، اور آپنے نعت کہتے وقت کس حد تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کے مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے، وہاں دوسری طرف یہ بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپنے تاجدار مدینہ، شافعِ روز جزا، محبوبِ رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ محامد و محاسن، کمالات نبوت، اخلاق حمیدہ اور گنہگارانِ امت کے ساتھ آپ کی رحمت وشفقت کے تعلق کو بیان اور اپنے جذبات عقیدت و محبت کا اظہار کرتے میں کس قدر پاس ادب، تعلیمات شرعی، تصورات اسلامی، عقائد مذہبی، حدود شناسی اور آداب نعت گوئی کا لحاظ رکھا ہے، اور پھر اس سب کے باوجود آخر میں یہ کہکر ؎

عالم الغیب کے سوا اے تاج   کون جانے کہ کیا ہے ذاتِ رسول

اپنے انتہائی عجز و انکسار کا اعتراف و اقرار کیا ہے۔

آخر میں حضرت تاج کے متفرق نعتیہ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

سارے عالم پر گھٹائیں رحمتوں کی چھا گئیں   جب جہاں میں رحمۃ للعالمیں پیدا ہوئے

عام تھا دنیا میں معبودانِ باطل کا اثر   پج رہے تھے آگ پانی خاک پتھر اور شجر

کوہ و دریا برق و باراں انجم و شمس و قمر   ماحی کفر و ضلالت جب ہوئے تھے جلوہ گر

آپ نے لہرادیا روئے زمیں پر لا کلام   وحدتِ خالق کا پرچم الصلوٰۃ والسلام

جو رضواں نے دیکھی بہار مدینہ   تو سب جنتیں کیں نثار مدینہ

جدھر تاج اٹھ جائیں میری نگاہیں   مرے سامنے ہو دیار مدینہ

جدھر دیکھیے جلوہ آرا محمدؐ   جدھر دیکھیے آشکارا محمدؐ

نہ پرہیزگاری نہ زہد و عبادت   ہے بخشش کا میری سہارا محمدؐ

ادھر مغفرت اور رحمت خدا کی
جدھر آپ کا ہو اشارا محمدؐ

سب نذر خزاں ہو گئے دنیا کے گلستاں
سرسبز گلستانِ رسولِ عربیؐ ہے

اس ہاتھ میں کونین کے ہیں سارے خزانے
جس ہاتھ میں دامانِ رسولِ عربی ہے

اے تاجؔ یہ سب حسن حسینانِ جہاں کا
اک پرتوِ رخسارِ رسولِ عربی ہے

جس سے حاصل ہو نجاتِ اخروی
بالیقیں وہ اقتدائے مصطفیٰ

تاجؔ اس کا رتبۂ عالی نہ پوچھ
ہو گیا جو خاکِ پائے مصطفیٰ

یہی میرا ایماں یہی میرا مذہب
تلاشِ خدا جستجوئے محمدؐ

جھکے تاجداروں کے سر جس میں پہ
وہ دنیا میں ہے صرف کوئے محمدؐ

یہ سارا جہاں فیضِ تجلائے نبی ہے
ہر ذرہ نقابِ رخِ زیبائے نبی ہے

واعظ تجھے جنت کے نظارے ہوں مبارک
نظروں میں مری گنبدِ خضرائے نبی ہے

مانا کہ عبادات ہیں بخشش کا ذریعہ
کافی مری بخشش کو تولائے نبی ہے

ممکن نہیں محشر میں نہ ہو اس کی شفاعت
اے تاجؔ تہِ دل سے جو شیدائے نبی ہے

جامعِ ہر کمالِ انسانی
قابلِ ہر ثنا ہے ذاتِ رسول

عالم الغیب کے سوائے تاجؔ
کون جانے کہ کیا ہے ذاتِ رسول

جلوۂ شمعِ سرِ طورِ رسولِ عربی
جس کا سایہ نہیں وہ نورِ رسولِ عربی

کر دیا اپنے بھٹکے ہوئے انسانوں کو
مئے توحید سے مخمورِ رسولِ عربی

تجلیِ روئے محمد کا صدقہ
یہ سب رونقیں محفلِ دوسرا کی

حمایت پہ جب خواجۂ دوسرا ہیں
تجھے فکر کیا تاجؔ روزِ جزا کی

عراق میں جدید عربی شاعری کا ارتقاء

از

جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے پی ایچ ڈی لکچرر شعبۂ عربی وینکٹیشورا یونیورسٹی آندھرا

عراق نے جدید عربی شاعری کو پروان چڑھانے میں غیر معمولی حصہ لیا ہے، اس سرزمین سے جدید شاعری کے ایسے عظیم شعراء شاعری کی بساط پر رونق افروز ہوئے جنھوں نے فکر و فن کو نئے پیمانے عطا کئے اور عربوں کے سامنے نئے اسلوب و خیالات پیش کیے، ان میں جمیل زہاوی، معروف رصافی اور کاظمی نے اپنی شاعری سے پیامبری کا کام لیا ہے، ان کے یہاں اسلامیت، وطنیت اور عربیت کے جذبات کا ایسا متوازن امتزاج ہے جیسے گلاب کی پنکھڑی کا رنگ جس میں یہ امتیاز دشوار ہوتا ہے کہ کہاں رنگ ہلکا ہے اور کہاں سے شوخی شروع ہوتی ہے، اس بنا پر یہ فیصلہ دشوار ہے کہ ان کے کلام پر اسلامیت غالب ہے یا قومیت، رصافی اور کاظمی کے کلام میں زہاوی کے کلام کے مقابلے میں اسلامی رنگ زیادہ نمایاں ہے، زہاوی آزاد خیال شاعر ہے، عراقی شعراء کے یہاں مذہبیت زیادہ نظر آتی ہے، امتِ اسلامیہ کے زوال کی داستان، اصلاح کی کوشش، تعلیمی و تمدنی میدان میں آگے بڑھنے کے حوصلہ اور معاشرتی و سیاسی زندگی میں بلندی کے خیالات سے عراقی شعراء کا کلام مملو ہے،

اس دور کی شاعری کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعری پوری طرح زندگی کی ترجمان بن گئی ہے، جس میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی جملہ مسائل شامل ہیں، جس سے

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی پوری تاریخ مرتب کیجا سکتی ہے، عراقی شاعری میں رومانیت کے بجائے حقیقت پسندی غالب نظر آتی ہے، رومانیت کے اثرات لبنانی اور مصری شعراء میں زیادہ ہیں، عراقی شعراء نے نچلے طبقہ کی ترجمانی کا بھی حق ادا کیا ہے،

تاریخی پس منظر دور جدید سے قبل عرب کا پورا ملک ترکی خلافت میں شامل تھا، عراق بھی شام اور لبنان کی طرح ترکوں کی حکومت میں تھا، اور عرب ترکوں کی حکومت کو غلامی سمجھ کر اس سے آزاد ہونے کے متمنی تھے، اس کے لیے انھوں نے ترکوں سے بغاوت کی، اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر، عراق اور شام وغیرہ تمام عرب ملکوں کو ترکوں کے بجائے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی غلامی سے سابقہ پڑا، عراق میں بھی یہی صورت حال پیش آئی، یہاں جنگ عظیم میں ترکوں اور انگریزوں میں بڑے معرکے ہوئے، ان میں عراقیوں نے ترکوں کا ساتھ دیا، انگریزوں کو ترکی کی جنگی تیاریوں کا علم ہو چکا تھا، اس لیے انھوں نے ۱۹۱۵ء میں اپنی فوجیں بصرہ میں اتار کر اس پر قبضہ کر لیا، عراق کے علماء نے جہاد کا فتویٰ دیدیا، جمیل زہاوی نے بھی ترکوں کو سامراجیوں سے ٹکر لینے پر ابھارا اور ان الفاظ میں ان کو جوش دلایا

الا ایها الجیش اللهام المعسکر — تقدم فانت المستطیع المظفر

اے زبردست لشکر آگے بڑھ، تو ہی فتح مند ہوگا۔

بل الالمان الیوم من کل دولة — اشد مراسا للحروب واقدر

جرمن آجکل تمام قوموں سے جنگ میں زیادہ طاقتور اور اس پر قادر ہیں۔

سأغسل عنی العار بالسیف انه — لیصدق عند الضرب ویتکسر

میں عنقریب تلوار سے عار کو مٹادوں گا زیادہ کامیاب ہوگی یا پھر ٹوٹ جائے گی۔

ایک دوسرا شاعر بتاتا، اعلان کرتا ہے کہ غلامی عربوں کی عظمت کے منافی ہے اس لیے آگے بڑھ کر اقدام کرنا چاہیے،

بنی العراقين حل الخصم ساحتكم — وفی ساحتکم له مرعى ومقتسم

اے اہل عراق! دشمن تمھارے صحن میں آگیا اور مزے اڑا رہا ہے۔

قد جاء من وراء البحر معتزماً — وذاك عار عليكم ليس ينحسم

وہ سمندر کے پیچھے سے آیا ہے اور تمھارے لیے ایسا عار ہے جو مٹ نہیں سکتا۔

اجدادكم تحت طی التراب تندبكم — این الجلالة این الباس والهمم

تمھارے آباء واجداد مٹی کے نیچے تم پر نوحہ کرتے ہیں کہ وہ شان، وہ بہادری اور ہمت کہاں گئی؟

عراقیوں سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے:

فکیف یهناء لکم عیش بارضکم — والانکلیز بها یرسی لهم قدم

تمھارے وطن میں تمھاری زندگی کیسے خوشگوار ہو سکتی ہے جبکہ یہاں انگریزوں کے قدم جم گئے ہیں

وہ یہ سبق دیتا ہے کہ موت سے کسی کو رستگاری نہیں، اور جو راہ خدا میں ملک وملت سے دفاع کرتے ہوئے مارا جائیگا اس کو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا!

كل نفس مصيرها الموت لكن — من يمت بالدفاع مات شهيدا

ہر انسان کا انجام موت ہے لیکن جو مدافعت کرتے ہوئے مرے گا وہ شہید ہوگا۔

جنگ عظیم کے دوران میں کئی معرکوں میں ترکوں نے عراق میں اتحادیوں کو شکست دی، انکی کامیابی پر عراقی شعراء نے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا، واقعہ "الدردنیل" میں ترکوں کی کامیابی پر کاظم آل نوح کہتا ہے:

حصن الله حوزة الدردنيل — بكماة غلب وآساد غيل

اللہ نے دردنیل کی حفاظت فرمائی غالب ہونے والے شیروں اور سورماؤں سے

طهر الله ان تجس منها بإحتلال الاعداء بعض التلول

اللہ نے اس کے ٹیلوں کو دشمنوں کے تسلط کی نجاست سے پاک کیا

جعلت للاسلام حصنا منيعا عادت بدهشة المذهول

دشمنوں نے اسلام کے سنگین قلعہ سے ناواقفیت کا ثبوت دیا، اسلیے وہ ناکام و نامراد ہوئے

بنا، اس واقعہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

يا بنفسي من حافظوا الدر دنيل وعلى الائتلاف سدوا السبيلا

اے دردنیل کے محافظو! تم پر مری جان فدا ہو، تم نے جان پر کھیل کر دشمن کی راہ روکی۔

حافظوا مركز الخلافة حتى عاد ما حاول العدى المستحيلا

انھوں نے مرکز خلافت کی حفاظت کی یہاں تک کہ دشمنوں کی کوشش کو ناکام کر دیا۔

"معرکۂ کوت" پر ابو المحاسن کہتا ہے:

سرت نفحة الظفر العاطرة بارجاء اوطاننا الزاهرة

ہمارے پر رونق وطن کے تمام گوشوں میں کامیابی کی خوشبودار ہوا چلی

یہی شاعر "معرکہ سلمان پاشا" کی فتح پر کہتا ہے۔

فيا يوم سلمان انت الذي جعلت وجوه الهدى ناضرة

اے یوم سلمان! تونے ہدایت کے چہرہ کو ظفرمند بنا دیا۔

وقد ادرك ثارها المسلمون فيها من الفئة الدائرة

اس جنگ میں مسلمانوں نے بدبخت جماعت سے بدلہ لے لیا

۱۱ر مارچ ۱۹۱۷ء کو جب انگریزوں کی فوجیں بغداد میں داخل ہوگئیں، اس وقت بغداد میں ترکی سپہ سالار خلیل پاشا شہر چھوڑ کر بھاگ گیا، رصافی اس کے فرار کی شکایت ان الفاظ میں

کرتا ہے:

اين اهل الحفاظ هل تركوني نهبة في يد العدو راحوا

محافظین کدھر گئے؟ انھوں نے دشمنوں کے ہاتھ میں شکار بنا کر خود راہ فرار اختیار کی

مگر اس کے دل میں ترک قوم کی محبت بدستور قائم ہے

انا باق على الوفاء وان كانت لقلبي ممن احب جراح[1]

میں وفا پر قائم ہوں اگرچہ محبوب نے میرے دل کو مجروح کر دیا ہے۔

جنگ عظیم کے بعد عراق میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی مگر مصر و شام کی طرح عراقی کبھی اس غلامی پر رضامند نہ ہوئے اور اندر اندر بغاوت کی آگ بھڑکتی رہی، عراق کے علماء و شیوخ نے جہاد کا فتوی دیا اور اسلام کے نام پر عراق کے عوام کے جذبات ابھارے، فوج بھی بغاوت کے نشہ سے سرشار ہوگئی، عوام نے پوری طرح اس کا ساتھ دیا، اس کا عکس عراقی شاعری کے آئینہ میں پوری طرح نظر آتا ہے، اس دور کی شاعری میں ایک گہرا مذہبی شعور پیدا ہوگیا، جو کبھی اسلامیت کے رنگ میں کبھی وطنیت کے پردہ میں، کبھی قومیت کے لباس میں اور کبھی سامراجیت سے نفرت کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا، ان شعراء نے پہلے ترکوں کے تسلط کے خلاف جد و جہد کی، پھر جب عراق پر انگریز قابض ہوگئے تو وہ ان کے خلاف پوری قوت سے میدان میں اتر آئے، ترکوں سے تو ان کا مذہبی رشتہ تھا، مگر انگریز تو ان کے لیے بالکل ہی اجنبی تھے، اس لیے اہل عراق نے اس ذلت کو گوارا نہ کیا اور مسلمان عرب شعراء نے دین کو اس سے آزادی کا وسیلہ بنایا، اس طرح دینی فکر نے ان کو آزادی کی شمع دکھائی۔[2]

[1] الشعر العراقي الحديث مصنفہ ڈاکٹر عز الدين مطبع اسعد بغداد ۱۹۶۰ء ص ۸۳ [2] ايضاً ص ۱۵۰

ایک عراقی شاعر عربوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے

خذ الحقوق جميعها   او مت عزيزاً و استرح

اپنے تمام حقوق حاصل کرلے یا عزت سے جان دیکر ابدی سکون حاصل کرلے

نباء کہتا ہے:

نحاربها والحروب خير محرّر   وان كره الاعداء مر مذاقها

ہم دشمنوں سے لڑیں گے اور جنگیں بہترین آزادی دلانے والی ہیں اگرچہ اسکے تلخ مزے کو ناواقف ناپسند کریں۔[1]

انگریزوں کے خلاف عراقیوں کی بغاوت کا خاص سبب شیخ شعلان ابوالجون کی گرفتاری تھی، اس سے ان میں اتنا اشتعال پیدا ہوا کہ انھوں نے جیل توڑ کر شیخ کو چھڑا لیا، اس کے انتقام میں فوج نے مظالم شروع کردیے، اس سے تمام قبائل میں بغاوت پھیل گئی، بعض فوجی افسر بھی اس میں شریک ہوگئے اور "الرارنجیہ" کا مشہور معرکہ پیش آیا، مذہبی زعماء کے اعلان جہاد نے میدان کا رنگ بدل دیا، جواہری کہتا ہے:

وللفرات نهضة   مشهودة لا يجحد

فرات (عراق) میں ایسا زبردست انقلاب جس کا انکار ممکن نہیں

واقعہ "عوجہ" میں انگریزوں کو سخت شکست ہوئی، انھوں نے غصہ میں ریل کی پٹریاں تک اکھاڑ دیں جس سے ٹرین الٹ گئی، جواہری کہتا ہے:

وللقطار وقعة   منها تفر الكبد

ٹرین کا واقعہ ایسا سخت ہے جس سے سینہ شق ہوجاتا ہے۔

ما تركوا حتى الحديد   سلسلوا وقيدوا[2]

انھوں نے لوہے تک کو نہ چھوڑا اور سب کو گرفتار کرلیا۔

---

[1] الشعر العراقی الحدیث ص ۱۰۵ [2] ایضاً ص ۱۵۶

مگر آخر میں یہ بغاوت ناکام ہوگئی، انگریزوں نے ہوائی حملے کیے جس میں بہت سے عراقی کام آئے، اور بہت سی عورتیں اور بچے دوسرے ملکوں خصوصاً کویت چلے گئے، ایک شاعر کہتا ہے

سئمت العيش فی وطن   يضام بذل يضطهد

میں ایسے وطن میں جینے سے گھبرا گیا ہوں جہاں انسان ذلیل کیا جاتا ہے اور اس پر مظالم توڑے جاتے ہیں۔

محته يد القضاء فراح   لا روح ولا جسد

قضا کے ہاتھ نے یہ سب کچھ دیا ہے، نہ اس میں روح باقی ہے اور نہ جسم

عراقی شعراء نے عراق کے حالات پر اتنا کہا ہے کہ انکے اشعار سے عراق کی سیاسی و سماجی تاریخ مرتب کیجا سکتی ہے۔ حافظ ابراہیم کے علاوہ عراق کی سیاسی اور سماجی شاعری میں اور بہت سے شعراء کا حصہ ہے، انھوں نے ہر واقعہ کی تصویر کشی کی ہے، انگریزوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کا نقشہ ایک شاعر نے ان الفاظ میں دکھایا ہے:

ليل السقوط بدا بالنحس طالعه   تصادمت فيه بالاهوال اهوال

بغداد کے سقوط کی رات کا ستارہ نحوست کیساتھ طلوع ہوا جس میں دہشت ہی دہشت ہے

انگریز دستور اور حقوق کا جو ڈھونگ رچاتے ہیں ان کی حقیقت رصافی نے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے۔

علم ودستور ومجلس امة   كل عن المعنى الصحيح محرف

علم، دستور، قومی مجلس سب اصل سے تحریف شدہ ہیں

اسماء ليس لنا سوى الفاظ   اما معانيها فليست تعرف

یہ صرف نام ہیں جن میں الفاظ کے سوا کچھ نہیں اور جن کے معنی کا پتہ نہیں

عبیدی کہتا ہے:

نحن فی معجم السیاسۃ احرا ... ر ولکن قاصرین یتامیٰ

ہم سیاست کی لغت میں آزاد ہیں مگر حقیقۃً بے بس یتیم ہیں

اثقلت کاھلا وادمت قلوبًا ... واذلت من النفوس کراما

تم نے کاندھوں کو بوجھل، دلوں کو زخمی اور معزز لوگوں کو ذلیل کر دیا

انگریزوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے:

کلما فکر العراقی فیھا ... لعن الدار والحمی والمقاما

جب عراقی عراق کے بارے میں سوچتا ہے تو ملک، وطن اور مقام پر لعنت بھیجتا ہے (جہاں انگریزوں کی لعنت مسلط ہے)

انگریزوں نے عراق کو نام کی آزادی دیکر ایک مجلسِ مشاورت بنائی، عراقی وزیر بھی مقرر کیے، لیکن سب نام کے تھے، محمد باقر شبیبی کہتا ہے:

احکومۃ والاستشارۃ ربھا ... وحکومۃ فیھا المشاور یحبد

وہ بھی کوئی حکومت ہے جس میں مشیر کا درجہ رب کا ہو اور اس کی پوجا کیجائے۔

الحکم حکمھم بغیر منازع ... والامر مصدرہ لھم والحواد

سارے اختیارات انگریزوں کو حاصل ہیں وہی سیاہ وسپید کے مالک ہیں

رصافی ان الفاظ میں کہتا ہے:

فوزیر القوم لا یعمل ... من غیر اشارہ

قوم کا وزیر بغیر اشارے کے حرکت نہیں کر سکتا۔

وھو لا یملک عملاً ... غیر کرسی الوزارۃ

وہ وزارت کی کرسی کے علاوہ عملاً کسی شے کا مالک نہیں۔

۱۹۲۲ء میں اہل عراق اور انگریزوں کے درمیان مزید حقوق وآزادی کا معاہدہ ہوا، اس کا ذکر رصافی نے اس طرح کیا ہے

العھد بین الانجلیز وبیننا ... کالعھد بین الشاۃ والرئبال

ہمارے اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ ایسا ہے جیسے بکری اور شیر کے درمیان عہد ہو

صالح جعفری اس کو سراسر غلامی قرار دیتا ہے۔

اسراھم قید والرائی ... فلم سموہ لی حرًا

انگریزوں نے آزادی رائے کو قید کر لیا ہے، پھر اسکو آزادی کا نام کیوں دیتے ہیں

وما فائدہ الرائی ... اذا لم ابدہ جھرا

اگر علانیہ رائے کا اظہار نہ کیا جا سکے پھر آزادی رائے کیا ہوئی۔

اس بغاوت کی ناکامی نے اہل عراق میں اور زیادہ جوش پیدا کر دیا اور شام وحجاز کی مکمل آزادی نے ان کے حوصلے اور بڑھا دیے، اس لیے انگریز رفتہ رفتہ ان کو حقوق دینے پر مجبور ہو گئے، چنانچہ ۱۹۲۷ء کے معاہدہ کے مطابق انگریزوں کی سرپرستی میں وزارت قائم ہوئی جو پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ تھی، اور ۱۹۳۲ء میں عراق کو مکمل آزادی مل گئی، [1]

سیاسی معاملات کے علاوہ عراقی شعراء نے معاشرتی اور سماجی مسائل پر بھی کہا ہے اور اپنے نقطۂ نظر سے معاشرتی اصلاح کی کوشش کی ہے، زہاوی آزاد خیال شاعر ہے اس نے پردہ کی مخالفت میں اخبار "المؤید" میں "المراۃ والدفاع عنھا" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا، مگر مسلم معاشرہ اس کے لیے تیار نہ تھا، اس لیے ایک طوفان برپا ہو گیا،

[1] الشعر العراقی الحدیث ص ۱۸۷

اور زہاوی نے ڈر کر گوشہ نشینی اختیار کرلی[۱] ۔ زہاوی کہتا ہے

کیف یسموا الی الحضارۃ شعب　　فیہ نصف عن نصفہ مستور

وہ قوم تہذیب میں کیسے ترقی کرسکتی ہے جس کا نصف حصہ مستور ہو

بسیم الدویب کہتا ہے

ظلمک سجنک زوجک　　شر زوج فی الوجود

تیرا شوہر نہایت برا ہے ، اس نے تجھ کو قید کرکے تجھ پر بڑا ظلم کیا ،

قائلا زوجی لا تخرج الا　　یوم تدعوھا اللحود

جس کا قول ہے کہ میری بیوی لحد ہی کے لیے گھر سے نکلے گی ۔

لیکن بنا بے پردگی کی شدید مخالفت کرتا ہے :

ایھا القوم اصلحوا انفسکم　　خاب من رام سفور الوجہ خابا

اے قوم اپنے نفس کی اصلاح کر ، جس نے بے پردگی کا ارادہ کیا وہ ناکام رہا ۔

وجوہ الغانیات بلا نقاب　　تصید الصید فی شرک العیون

عورتوں کے بے نقاب چہرے آنکھوں کے جال سے شکار کرتے ہیں ۔

دور جدید کے دلپسند موضوع غربت اور سرمایہ داری کے متعلق بھی اپنے جذبات واحساسات ظاہر کیے ہیں ، احمد الصافی کسانوں کی ہمدردی میں کہتا ہے :

رفقاً بنفسک ایھا الفلاح　　تشقی وسعیک لیس فیہ فلاح

اے کسان اپنی حالت دیکھ تو محنت کرتا ہے مگر تیری محنت کا صلہ تجھکو نہیں ملتا ۔

فی اللیل بیتک مثل دھرک مظلم　　ما فیہ شمع ولا مصباح

تیرے زمانہ کی طرح تیرا گھر رات کو تاریک رہتا ہے ، نہ اس میں شمع ہے اور نہ چراغ ۔

---

[۱] الشعر العراقی الحدیث ص ۲۵۱ ،

فیخر سقفک ان ھمت عین السماء　　ویطیر کوخک ان تھب ریاح

اگر پانی برسے تو تیری چھت گر پڑے اور اگر ہوا چلے تو تیرا جھونپڑا اڑ جائے

عرق الحیاۃ یسیل منک لآلیا　　فنیزان منھا للغنی وشاح

تیری زندگی کا پسینہ چمکتا ہوا بہتا ہے جس سے نوجوان کی چادریں منقش و مزین کیجاتی ہیں

کسانوں کی بدحالی کا نقشہ مختلف شاعروں نے بڑے درد انگیز انداز میں کھینچا ہے مثلاً صالح بحر العلوم کہتا ہے :

تقبل ایھا الفلاح منی　　عواطف یلتھبن بھا شعوری

اے کسان ! میرے جذبات کو جو میرے شعور پر منعکس ہوئے ہیں قبول کر ۔

ولا تحزن اذا لم تلق ثوباً　　یقیک وثوب غیرک من حریر

تو اس پر غمزدہ نہ ہو کہ تیرے پاس ستر پوشی کے لیے بھی کپڑا نہ ہو اور دوسرے حریر میں ملبوس ہوں ۔

فشان الدھر لم یعرف ضعیفا　　ولم یألف مجاورۃ الفقیر

زمانہ کی حالت یہ ہے کہ وہ کمزور کو نہیں پہچانتا اور غریب کے پڑوس سے مانوس نہیں ہوتا ،

ایک دوسرا شاعر محمد مہدی جواہری جاگیرداری کے خلاف آواز اٹھاتا ہے :

الا قوۃ تستطیع دفع المظالم　　وانعاش مخلوق علی الذل نائم

کیا کوئی ایسی قوت ہے جو ظلم و ستم کو دور اور ذلت میں سونے والی مخلوق کو اٹھا دے

تعالت ید الاقطاع حتی تعطلت　　عن البت فی احکامھا ید حاکم

جاگیرداری کا اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ اس کے احکام کے روکنے سے حکومت کا ہاتھ بھی قاصر ہو گیا

ھی الارض لم یخصص اللہ مالکاً　　یصرفھا مستھتراً بالجرائم

وہ زمین جس کا خدا نے کسی خاص طبقہ کو مالک نہیں بنایا اسکو جاگیردار اوباشی اور جرائم میں صرف کرتا ہے ۔

ان اشعار سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ عراقی شاعری زندگی کے خزانوں سے بھرپور، قدیم روایات کی تقلید سے دور اور سیاسی، وطنی اور سماجی مسائل سے اس کا دامن معمور ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ عراقی شعرا حقیقت پسند ہیں، جدید مسائل پر انکی پوری نگاہ ہے، ان میں بعض آزاد خیال اور مغرب زدہ ہیں، لیکن ان کی اکثریت کے جذبات اسلامی ہیں، زہاوی میں آزاد خیالی زیادہ ہے، لیکن رصافی اور کاظمی کا کلام اسلامی جذبات سے معمور ہے۔

عبد المحسن کاظمی | ابو المکارم عبد المحسن کاظمی نجفی ۱۲۸۲ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، ان کے والد تاجر تھے، اس لیے شروع میں وہ بھی تجارت کی طرف مائل ہوئے، پھر اس کو چھوڑ کر کھیتی کی طرف گئے، مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ان کا رجحان ادب کی طرف ہوا، اور اس کا شوق اتنا بڑھا کہ قدیم شعرا، کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور ان کے بارہ ۱۲ ہزار اشعار حفظ کر ڈالے اور ۲۰ سال کی عمر میں ان کی ادبیت کا شہرہ عام ہو گیا،

کاظمی کو مسلمانوں کے انحطاط کا شدید احساس تھا، وہ اس پر برابر غور و فکر کرتے رہتے تھے، اسی زمانہ میں سید جمال الدین افغانی ایران سے جلاوطن ہو کر بغداد پہنچے، اسلیے کاظمی کو ان سے کسب فیض کا موقع مل گیا اور انھوں نے ان کے اعلیٰ اسلامی افکار کو شمع راہ بنایا، لیکن جب جمال الدین افغانی عراق سے نکالے گئے تو اس کی زد کاظمی پر بھی پڑی، انھوں نے ایرانی سفارت خانہ میں پناہ لی، پھر خفیہ طور پر ...... بصرہ چلے گئے، چند مہینہ فارس میں قیام کر کے وہاں سے مصر کی راہ لی، وہ بغداد واپس آنا چاہتے تھے، مگر سیاسی حالات سے قطع نظر امراض نے ان کو سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا، آنکھوں کی بصارت جاتی رہی، گو دل کی

روشنی اور تیز ہو گئی، مصر میں انھوں نے شیخ محمد عبدہ سے کسب فیض کیا، اس لیے ان کے فکر و خیال پر اسلامی رنگ بہت گہرا ہے، جو ان کی نظم و نثر دونوں میں نمایاں ہے، مندرجۂ ذیل تصانیف ان کی یادگار ہیں،

۱- البیان الصادق فی کشف الحقایق۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کے نفاق و اختلاف پر بحث کی ہے۔

۲- تنبیہ الغافلین۔ اس میں امت کے امراض کی نشاندہی کر کے اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا صحیح علاج تجویز کیا ہے۔

۳- دیوان شعر۔

شاعری | کاظمی کا شمار طبقۂ اول کے شعرا میں ہوتا ہے، وہ عراق کے تین اساطین شعرا میں سے ایک اہم شاعر ہیں، یعنی زہاوی، رصافی اور کاظمی، ان تینوں کے کلام میں فنکارانہ عظمت ہے، لیکن وطن کی محبت اور اسلام کا درد کاظمی کا خاص حصہ ہے۔ وہ شاعر استقلال ہے جس نے پوری عمر آزادی کے گیت گائے، اور دلوں میں شوق و محبت کی آگ لگائی، اس نے اپنے پرسوز نغموں میں اہل عراق کے دلوں میں اسلام کا درد پیدا کیا، اس کے کلام میں زہاوی کے کلام کی طرح فلسفیانہ عمق نہیں ہے، اس کی عظمت کا راز، کلام کی جودت، متانت، حسن بیان اور قافیہ کی روانی میں پوشیدہ ہے، یہی چیزیں حافظ ابراہیم کا بھی سرمایۂ شاعری ہیں، اس لیے ریفائیل بطی کا خیال ہے کہ حافظ نے روانی، موسیقیت اور حسن قافیہ کا طرز کاظمی سے اپنایا ہے۔

کاظمی کو بدیہہ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا، اکثر وہ ایک ہی مجلس میں کئی کئی سو اشعار کا قصیدہ موزوں کر لیتے تھے، ایک بار ابراہیم شدی نے ان کی شان میں ایک قصیدہ

پڑھا تو انھوں نے اس کے جواب میں اسی بحر و قافیہ میں اسی مجلس میں اس کا جواب لکھ کر پیش کر دیا، اس بدیہہ گوئی پر لوگ متحیر رہ گئے،

کاظمی کی شاعری میں دو عناصر اور نظر آتے ہیں، ایک قدیم صحت مند عناصر، قدامت فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں، بغیر ماضی سے تعلق قائم کیے ہوئے مستقبل کی بنیاد مضبوط نہیں ہوسکتی، کاظمی نے ان صحت مند عناصر کو جدید عناصر سے ملا کر بڑی خوبی سے پیش کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جن شعرائے زبان و ادب کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے، ان سب کے یہاں دو چیزیں مشترک ہیں، ایک ایک قدامت کے صحت مند عناصر سے قوی رشتہ، دوسرے اسلامی اقدار حیات کی عظمت، یہی چیزیں حافظ، شوقی، رصافی اور زہاوی کے یہاں بھی نظر آتی ہیں، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عالم اسلامی میں قوم و ملت کے احیار کی جتنی تحریکیں چلیں وہ سب چٹائی پر بیٹھکر پڑھنے والے قدیم علوم کے علماء نے چلائیں، ہندوستان میں سرسید اور علامہ شبلی، مصر میں سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ وغیرہ اسی طبقہ سے تھے، انھوں نے اپنے دور کے ادباء و شعراء سے بھی اصلاح کا کام لیا، ہندوستان میں اس کی مثال مولانا حالی ہیں، کاظمی پر سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کا اثر تھا،

(باقی)

سیاست میں اسلام

(۲)

مترجمہ محمد آفاق صاحب ایم اے علیگ

سویت وسط ایشیا

وسط ایشیا کی سویت حکومت میں رہنے والے مسلمانوں اور اسلام سے متعلق متضاد خبریں ملتی رہتی ہیں، کبھی سننے میں آتا ہے کہ مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہے، انکی اقتصادی حالت بہت اچھی ہے، ان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی ہے، وہ اپنے مذہب اور تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کی کوشش میں بالکل آزاد ہیں، اور کبھی سنا جاتا ہے کہ وہ ایک طرح کی نوآبادیاتی حکومت کے ماتحت نسلی امتیاز کا شکار ہیں، اور اسلام کی صورت بالکل مسخ کر دی گئی ہے، کبھی یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اسلامی ثقافت کو سویت نظام میں اس طرح ختم کر دیا گیا ہے کہ وہ آخری سانس لے رہی ہے،

سویت روس کے ڈھائی کروڑ مسلمانوں میں تقریباً نصف سے زیادہ سویت ایشیا میں آباد ہیں، ۱۸۳۰ء کے بعد سے ان مسلمانوں کی سرزمین برابر روسیوں کی فتوحات میں شامل ہوتی رہی یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اواخر میں پورا علاقہ جو اب سویت ایشیا اور قازخستان کے نام سے مشہور ہے، براہ راست روسیوں کے زیر حکومت ہوگیا، صرف بخارا

اور خفا کے علاقے کو نیم آزاد ریاست کی حیثیت سے کچھ دنوں کے لیے چھوڑ دیا گیا، لیکن روس کے انقلاب کے بعد ہی ان کو بھی سویت حکومت میں شامل کر لیا گیا اور پورے مسلم علاقہ کو اسکی قوموں کے اعتبار سے پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، ان قوموں کے نام یہ ہیں: قازخ، ازبک، ترکمان، کرغیز اور تازخ۔ ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان نئے نظام حکومت کے خلاف مسلح جنگ جاری رہی، آخر میں ۱۹۳۰ء میں سویت نظام کو غلبہ حاصل ہو گیا، جو اب تک برقرار ہے،

سویت حکومت نے ابتدا ہی سے اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا، اس کی مخالفت صرف اسی لئے نہیں کی گئی کہ وہ ایک مذہب ہے، بلکہ ایک ایسا نظام حیات اور طرز زندگی ہے جو اشتراکیت کی ترقی میں رکاوٹ ڈالتا ہے، اور جدید طرز زندگی کو اپنے اندر ضم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ سویت نظام یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اسلام کے اثرات قومیت کے حدود سے بہت آگے ہیں، اس لیے اس کو اندیشہ تھا کہ اسلام کے حلقۂ اثر سے نہ نکل سکیں گے، دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ اسلامی ثقافت روس کی ثقافت کے بالکل ضد اور روسی قوم و ملک دونوں کے لیے مضر ہے، اس کے مقابلہ میں وہاں کے عیسائی کلیسا کو روسی ثقافت کا جزو لازم تصور کیا جاتا ہے،

سویت کی مسلمان ریاستوں کی سیاسی حیثیت اور ان کا اصول نظم و نسق سویت روس کی دوسری ریاستوں کے برابر ہے، سرکاری طور پر ان ریاستوں کو مکمل خود مختار ریاست کہا جاتا ہے، لیکن ان کی خارجہ پالیسی، قومی دفاع، داخلی تحفظ، ذرائع آمد و رفت اور بعض دوسرے امور براہ راست سویت حکومت کے قبضہ میں ہیں، ان ریاستوں کا چین، افغانستان، ایران جیسے ہمسایہ ملکوں سے کوئی سفارتی، ثقافتی یا کاروباری رشتہ نہیں ہے،

ہر ریاست کی اپنی کمیونسٹ پارٹی ہے، جو سویت یونین کی مرکزی پارٹی کے تحت کام کرتی ہے۔ ان سب ریاستوں کے باشندے بلا امتیاز قومیت بنیادی طور پر سویت یونین کے شہری خیال کیے جاتے ہیں، اور ان کا جذبۂ حب الوطنی ان کی ریاست کے بجائے سویت یونین سے وابستہ سمجھا جاتا ہے،

سویت ایشیا کی تشکیل کے بعد چالیس سال کی مدت میں بلاشبہ ان ریاستوں کی مادی حالت بہت بہتر ہو گئی ہے، خاص طور سے صحت عامہ، صنعتی پیداوار، روئی کی کاشت، آمد و رفت کے ذرائع اور معیار زندگی میں نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ ان تمام امور میں یہاں کے مسلمان جاپان اور اسرائیل کے علاوہ تمام ایشیائی ممالک سے بہتر حالت میں ہیں، اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ مرکزی حکومت ان کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے، بلکہ یہاں کے مسلمانوں نے بڑی تیزی سے اپنی صلاحیتوں کو سنوارا اور ان سے کام لیا ہے، اگرچہ ان کو اپنے معاشی اور مالی معاملات میں پوری آزادی حاصل نہیں ہے، پھر بھی وہ تجربہ اور صلاحیت کی بنا پر اپنے کو روسیوں سے کسی درجہ میں بھی کم تصور نہیں کرتے اور یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہیں ہے کہ روس میں نسلی امتیاز نہیں برتا جاتا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں یہاں مساوات زیادہ ہے،

مجموعی طور پر مسلمان اپنی معاشی حالت سے مطمئن نظر آتے ہیں، اور بظاہر اس کے اسباب بھی فراہم کر دیے گئے ہیں، لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ وہ ایک غیر مانوس نظام حکومت کے تحت زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور ہیں، مسلمانوں کے دانشمند طبقہ میں ایسی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ وہ موجودہ سیاسی حیثیت سے قطعی مطمئن نہیں ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس نظام نے بیشتر مادی معاملات مثلاً صنعتی و زراعتی ترقی، آبپاشی اور دوسرے ٹکنیکل امور میں یہاں کے لوگوں کی بہتری کیلئے دوسرے نوآبادیاتی نظام کے مقابلہ میں بہت کچھ کیا ہے، لیکن روحانی اور ثقافتی میدان میں

اس نظام نے جو تبدیلیاں کی ہیں وہ سخت قابلِ اعتراض ہیں، مثلاً تعلیم کو غیر مذہبی بنا دیا گیا، عبادت گاہوں پر تالے ڈال دیے گئے، مذہبی پیشواؤں کے مشاغل پر پابندی عائد کر دی گئی، اور خدا دشمن نظریات کی تبلیغ شروع کر دی گئی، عظیم انقلاب کے بعد ہی سے تمام مذاہب کے خلاف جو مہم شروع کی گئی تھی اس سے اسلام دشمن تحریک کی شکل بہت ملتی جلتی ہے، دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کو اس مہم سے زیادہ نقصان پہنچا، کیونکہ مسلمانوں کی تمام ابتدائی اور اعلیٰ درسگاہیں دینی علما کی نگرانی میں کام کرتی تھیں، ان کی عبادت گاہوں کی تعداد دوسرے مذاہب مثلاً عیسائیت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی، مسلمانوں میں کفر و الحاد کا تصور ناقابلِ فہم تھا، اور وہ محکوم ہونے کے باوجود اسلامی شریعت پر عامل تھے، انکی خانگی زندگی کا تانا بانا بھی اسلامی تھا، عورتوں کا سماجی مقام بھی وہی تھا جو اسلام نے متعین کر دیا تھا، یہانتک کہ فنونِ لطیفہ زبان و ادب میں بھی اسلامی تصورات پائے جاتے ہیں،

اس لیے ابتدا ہی سے سوویت نظام نے اسلامی ثقافت کی تمام شکلوں کو خواہ وہ روحانی ہوں یا مادی ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا اور اسکی جگہ ایک ایسی ثقافت کے مسلط کرنے کا فیصلہ کیا جو قومی جسم اور اشتراکی روح کی حامل ہو، اس مقصد کی تکمیل کے لیے جو سرکاری اقدامات کیے گئے وہ اگرچہ بہت وسیع تھے، لیکن اتنے موثر ثابت نہ ہو سکے جس قدر ارباب اختیار کو امید تھی، ۱۹۳۰ء کی ابتدا ہی میں تمام مکاتب اور مدرسے ختم کر دیے گئے، مگر ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۸ء میں صرف دو مدرسے کھول دیے گئے، ۱۹۱۷ء میں بیس ہزار آباد مسجدیں تھیں، لیکن اس وقت دو یا تین سو مسجدیں کھلی ہیں، ان میں اماموں اور خطیبوں کی تعداد کم کر دی گئی ہے، قانون شریعت معطل کر دیا گیا ہے، حج کے لیے صرف مخصوص لوگوں کو اجازت نامہ ملتا ہے، اسلامی روایات پر شدید حملے کیے جاتے ہیں، مقدس مقامات کی زیارت، پردہ، ختنہ اور اس قسم کی دوسری چیزیں جو کاروبار میں حائل ہوں ان کو قریب قریب ختم کر دیا گیا ہے، اسلام دشمنی کے ساتھ

الحاد کی مہم بھی مسلسل جاری ہے، البتہ بعض موقعوں پر ان کی شدت میں کمی کر دی جاتی ہے، مثلاً جب جرمنی نے روس پر ۱۹۴۱ء میں حملہ کیا تو دوسرے مذاہب کی حمایت کے ساتھ اسلام کی حمایت بھی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی، ایسے موقعوں پر معاندانہ رویہ کی شدت مصلحتاً کم کر دی جاتی ہے۔

ان منفی اقدامات سے قطع نظر سوویت ارباب اختیار نے ایک نئی تہذیب و ثقافت کی تشکیل کی غرض سے بہت سے مثبت اقدامات بھی کیے ہیں، ان میں سب سے اہم تعلیم ہے، جس کو سکولر بنا دیا گیا ہے، ۱۹۱۷ء میں اس علاقہ کے مسلمانوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کا اوسط تین فیصدی سے زیادہ نہ تھا، اعلیٰ تعلیم کا کوئی ادارہ نہ تھا، مگر اب جہالت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے، متعدد صنعتی تربیتی اداروں کے ساتھ ہی اس علاقہ میں چھ یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں، سوویت لسانی پالیسی کا تعلق تعلیم سے بہت قریبی ہے، اسلیے سب سے پہلے عربی رسم الخط لاطینی رسم الخط سے بدل دیا گیا، پھر ۱۹۴۰ء میں روسی حروف کی ایک ترمیم شدہ شکل کو علاقائی زبانوں کی تعلیم کے لیے جاری کیا گیا، ان علاقوں کی زبانیں مستقل ادبی حیثیت نہیں رکھتی تھیں لیکن اب اس قابل ہو گئی ہیں، قدیم عربی اور فارسی ماخذوں سے اخذ و استفادہ کا طریقہ ختم کر دیا گیا ہے، لیکن موجودہ عربی و فارسی عناصر کو ختم کرنے کی کوشش بڑی حد تک ناکام رہی، اس لیے کہ وہ علاقائی زبان و ادب میں اس طرح گھلے ملے ہیں کہ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا، قومی ادب کی تعمیر میں لسانی اصلاحات اس طرح کی گئی ہیں کہ اسلام کا ذکر بالکل ختم ہو گیا ہے البتہ اس کا حقارت آمیز ذکر ضرور آتا ہے، اور روس کی اس لسانی پالیسی کا دوسرا مقصد روسی زبان کی توسیع بھی ہے،

سوویت حکومت علانیہ روسی زبان کو ان علاقوں کے باشندوں کی دوسری مادری زبان بنانا چاہتی ہے جو غیر روسی زبانیں بولتے ہیں، اور یہ صحیح ہے کہ روسی زبان کے معقول علم کے بغیر

عملی طور پر ترقی کی راہیں بند ہیں، ابتدائی اور ثانوی درجات میں تعلیم علاقائی زبانوں کے ذریعہ دیجاتی ہے، لیکن اعلیٰ تعلیم اور فنی تعلیم کے لیے صرف روسی زبان استعمال کی جاتی ہے۔

مسجدوں کی قفل بندی، مذہبی درسگاہوں کے خاتمے اور مذہبی تہواروں کی چھٹیاں ختم کردینے کی وجہ سے تمام ظاہری دینی رسوم کی حیثیت عوامی زندگی میں بالکل ختم ہوگئی ہے، یہی صورت حال ان اسلامی ملکوں میں بھی ہے جہاں مغربی تہذیب کی ترقی میں اسلام معاون ثابت نہ ہوسکا ہے، یا جہاں اسلام کو ایک سیاسی تحریک سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں ہے، لیکن اسلام کی بقا مذہبی تقریبات اور اماموں کے وجود پر منحصر نہیں ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ ترکی، ایران اور دوسرے اسلامی ملکوں کے مسلمانوں کی طرح سویت مرکزی ایشیا کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں اسلامیت جاگزیں نہیں ہے، چنانچہ کفر و الحاد کی تبلیغ کے خلاف شروع میں جو نفرت پائی جاتی تھی وہ اب باقی نہیں ہے، مگر اسلام کی جو حالت تیس سال پہلے تھی، اب اس سے بہتر ہے، ۱۹۴۳ء میں سویت یونین میں چار روحانی محکمے قائم کیے گئے تھے، جن میں ایک تاشقند میں ہے، مگر اس کے اختیارات برائے نام ہیں، یہ محکمہ سرکاری نگرانی میں کام کرتا ہے، اور ظاہری طور پر اسلام کی بقا کی ایک علامت ہے، پرانی مسجدوں کی مرمت ہورہی ہے، اور ایک نئی مسجد زیر تعمیر ہے۔

کمسنی کی شادی اور دلہن کی خریداری کو مذہبی آثار میں شمار کیا جاتا ہے، اور اس سلسلہ میں سویت روس کا حوالہ دیا جاتا ہے، اور سویت کے ارباب اختیار

اس کو اسلام کی لازمی خصوصیات شمار کرتے ہیں، حالانکہ روس کے انقلاب سے پہلے مسلمان مصلحین اور جدید طبقہ ان چیزوں کا شدید مخالف تھا، جن کا اسلامی آثار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بنیگسان (Bennigsen) نامی مشہور فرانسیسی محقق نے جو سویت یونین کے اسلام کے بارہ میں سند کی حیثیت رکھتا ہے، کمیونزم اور اسلام کی ہم وجودیت پر رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب اسلام اور کمیونزم دونوں کو ایک مقام پر رکھا جائے، لیکن یہ صورت نہ تو سویت روس ہی میں ہے جہاں اسلام کو سماجی ڈھانچے سے خارج تصور کیا جاتا ہے، نہ مشرق وسطیٰ کے ان اسلامی ملکوں ہی میں ہے جہاں زندگی کے تمام شعبوں پر اسلام غالب ہے" اصولی طور پر اسلام اور کمیونزم ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں، لیکن سویت ایشیا کے دانشمند مسلمان اسلام اور کمیونزم کے درمیان صلح کرنے پر آمادہ ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ اس معاملہ میں حکومت کا جبر ختم ہوجائے۔

ایک تاتاری کمیونسٹ میر سلطان علی اوگلو نے انقلاب کے بعد ہی ایک ایسی تحریک شروع کی تھی جس کا مقصد ایک طرح کی "بین الاقوامی مسلم نوآبادی" کو وجود میں لانا تھا، مارکس نے مغرب کے صنعتی ملکوں کے لیے جو کمیونزم وضع کیا تھا اس میں سلطان علی اوگلو ایسی تبدیلی چاہتا تھا جس سے وہ ایشیا کے زراعتی ملکوں کے لیے قابل قبول ہوسکے، مگر اس کی اس کوشش کو انقلاب دشمن تحریک سمجھکر بڑھنے نہیں دیا گیا،

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سلطان علی اوگلو نے جس طرح کی قوم کا تصور پیش کیا تھا اس کا اثر آج ان بلند ذہن رکھنے والے مسلمانوں میں بالکل نہیں ہے، جو بظاہر مغربی تہذیب سے متاثر ہیں اور کمیونزم سے مطمئن ہونے کے باوجود ایمانی حیثیت سے مسلمان رہ سکتے ہیں۔

(جیارزی وہیلر ڈائرکٹر ادارۂ وسط ایشیائی تحقیقات لندن)

ادبیات

انسانیت

از

جناب طالب جے پوری

کرم کیا کیا کیے ہیں گلشنِ ایجاد پر میں نے
دیا ہے آبیاری کے لیے خونِ جگر میں نے

جبینِ چرخ پر افشاں چنی ہے چاند تاروں کی
شبِ تاریک کو بخشے ہیں انوارِ سحر میں نے

بنا ڈالی گئی جب قصرِ تہذیب و تمدن کی
دیا اس کے لیے دل کھول کر خونِ جگر میں نے

کیا ہے تجربہ تجزیۂ اضدادِ عالم کا
سکھایا ہے زمانے کو شعورِ خیر و شر میں نے

عطا کی ہے دلِ افسردہ کو گرمی محبت کی
لٹائی ہے متاعِ لذتِ سوزِ جگر میں نے

بھرا ہے زندگی کا رنگ مایوسی کے خاکوں میں
دیے ہیں تو گرفتارانِ غم کو بال و پر میں نے

مٹا کر اختلافِ باہمی اقوامِ عالم کا
کیا آبِ حیات و زہر کو شیر و شکر میں نے

سبق دے کر اولوالعزمی کا خاک افتادہ ذروں کو
کیا ہے مہر و ماہ و مشتری کا ہم سفر میں نے

بلندی پر رہا ہے مطمحِ فکر و نظر میرا
کیا ہے زندگی کی پست راہوں سے حذر میں نے

ملایا ہے تکبر خاک میں کفر و ضلالت کا
کیا ہے ذوقِ علم و آگہی کو مقتدر میں نے

اندھیرے میں بھی پا لے گی تجلی نورِ عرفاں کی
نگاہِ شوق کو بخشا ہے وہ حسنِ نظر میں نے

کسی کو پا کے اپنے آپ میں کھویا ہے اپنے کو
کسی کی دی ہے اپنے آپ کو با کر خبر میں نے

رہِ ہستی میں سنگِ میل ہے نقشِ قدم میرا
کیا ہے راہ رو کو بے نیازِ راہبر میں نے

سنوارے ہیں عروسِ زندگی کے کاکل و عارض
دیے ہیں اہلِ بینش کو نئے شام و سحر میں نے

بڑھا کر دسترس تا عرش اک انسانِ کامل کی
زمانے کو دکھا دی حدِ معراجِ بشر میں نے

چمن میں اپنی بے نوری پہ نرگس اب نہ روئے گی
کیے ہیں بزمِ رنگ و بو میں پیدا دیدہ ور میں نے

نہ ہونے پائے گی تاراجِ صرصر رونقِ گلشن
تبسم گل کو بخشا ہے بہ اندازِ دگر میں نے

رہے گا گلشنِ ایجاد مرہونِ کرم میرا
کیا ہے اس کو اپنی کوششوں سے بارور میں نے

غزل

از جناب حبیب احمد صاحب صدیقی ممبر پبلک سروس کمیشن

لاکھ چاہا مگر کبھی نہ گئی
اپنی خوئے صنم گری نہ گئی

نورِ ایماں کی تابشِ تسلیم
نہ گئی رسمِ آذری نہ گئی

باوجود ہزار ناکامی
خود فریبی کی دلکشی نہ گئی

شمعِ امید بھی بجھا نہ سکے
تم سے تو دشمنی بھی کی نہ گئی

اتنی مایوسیوں پہ بھی اے دوست
شکر ہے دل کی بیکلی نہ گئی

بارہا زندگی ہوئی پامال
پھر بھی توقیرِ زندگی نہ گئی

رہبری لاکھ کی محبت نے
اہلِ دانش کی رہزنی نہ گئی

کتنی محدود تھی ضیائے خرد
تیرہ بختوں کی تیرگی نہ گئی

بدلے رسم و رواجِ دہر بہت
ایک رسمِ ستمگری نہ گئی

آدمیت گئی تو اے ناداں
پا کے سب کچھ بھی یہ کمی نہ گئی

ایسے بینا کو کیا کہیں جس کی
آنکھ کے پار روشنی نہ گئی

جو کہانی لہو سے لکھی تھی
ہم سے وہ بھی کبھی کہی نہ گئی

اے ستارو تم اپنی راہ لگو
یہ شبِ ہجر ہے، گئی نہ گئی

غزل

از

جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری

خورشید و ماہ میں نہ کسی انجمن میں ہے
وہ روشنی جو حسن کی پہلی کرن میں ہے

اللہ رے کمالِ جنوں کی نوازشیں
اک ذوقِ آگہی مرے دیوانہ پن میں ہے

جو برقِ بے اماں کو بھی دے امن کی نوید
ایسا اک آشیانہ بھی صحنِ چمن میں ہے

منصور نے دیا ہے زمانے کو یہ پیام
لطفِ حیات سایۂ دار و رسن میں ہے

تنہائیٔ فراق سے ہیں جاں بلب سہی
لیکن مرا خیال اُسی انجمن میں ہے

کس نے نظر سے چھیڑ دیا سازِ حسن و عشق
اک زندگی کی موج رواں روح و تن میں ہے

جوہر وطن کی شان پہ آنے نہ دیں گے آنچ
جب تک لہو رگوں میں حرارت بدن میں ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

کمال اور زوال تاریخ جنگ یونان قدیم } از طوسی دیدیس، مترجمہ جناب میر حسن صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اوسط صفحات ۸۵۴ مجلد مع گرد پوش

قیمت ۲۰ عہ پتہ: ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی۔

یونان کی تاریخ پر انگریزی میں متعدد مفصل اور ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بعض کے اردو ترجمے بھی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے شائع ہو چکے ہیں، مذکورہ بالا کتاب قدیم یونان کی دو عظیم الشان ریاستوں ایتھنز اور اسپارٹا کی طویل جنگ کی تاریخ ہے، اس کا مصنف طوسی دیدیس اسی جنگ کے زمانہ یعنی پانچویں صدی قبل مسیح کا مشہور مورخ اور ایتھنز کا فوجی سپہ سالار تھا، اس لیے وہ ان لڑائیوں کے حالات کا عینی شاہد ہے اور اس کی یہ کتاب اس کی سب سے مستند دستاویز ہے، گو مصنف پر جانبداری اور غلط بیانی کا بھی الزام لگایا گیا ہے، لیکن عام طور پر اس تاریخ کو دنیا کی مشہور اور بلند پایہ کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے، یہ ضخیم کتاب آٹھ حصوں اور ۲۶ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں ابتدا سے اکیسویں سال تک کے جنگی واقعات تحریر کیے گئے ہیں، شروع کے پانچ ابواب میں جنگ پلوپونیز سے پہلے تک یونان کی سرگذشت، جنگ کے اسباب، سلطنت ایتھنز کے عروج و اقتدار کا بھی اجمالی ذکر ہے، اس کے بعد سا جنگ کے حالات اور ضمناً اس سلسلہ کی دوسری باتیں مثلاً معاہدات اور کانفرنسوں کی روداد، سربراہوں اور نمایندوں کی تقریریں وغیرہ بھی نقل کی گئی ہیں، مصنف نے صرف واقعات ہی

کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے اسباب بھی بیان کیے ہیں اور ان سے سبق آموز نتائج بھی
نکالے ہیں، یہ کتاب دراصل سلطنت ایتھنز کے تہذیب و تمدن کا مرقع اور اس کے عروج و زوال
کی دلچسپ داستان ہے، لیکن مصنف نے واقعات کے سنین اور تاریخیں نہیں لکھی ہیں جس سے
ان کے زمانہ کا اندازہ نہیں ہوتا، ضرورت تھی کہ فاضل مترجم مقدمہ میں مصنف کے متعلق
ضروری معلومات اور کتاب میں مذکور اشخاص و مقامات اور دوسرے مبہم مندرجات سے متعلق
توضیحی حواشی لکھتے، اس کے بغیر اس کتاب سے پورا استفادہ عام لوگوں کے لیے بہت دشوار ہے،

فن اور تنقید - مرتبہ جناب انور کمال حسینی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت
عمدہ، صفحات ۲۳۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت للعہ/ ادارہ خرام پبلیکشنز، حوض قاضی، دہلی ۶

یہ موجودہ دور کے اردو کے نامور ادیبوں اور ناقدین کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے
اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے، پروفیسر احتشام حسین نے تنقید کی ضرورت
اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس کی حقیقت و غایت بیان کی ہے، ڈاکٹر سید عبد اللہ نے
اردو کی ادبی صلاحیتوں یعنی دوسری زبانوں اور ان کے خیالات سے اخذ و استفادہ اور
ارتقائی صلاحیت، اس کے لازوال و پائدار ادب اور اس کی موجودہ عارضی سست رفتاری
پر بحث کی ہے، ڈاکٹر اعجاز حسین نے اردو ادب میں قومی عناصر کی نشاندہی کی ہے، فراق
گورکھپوری نے غزل کی ماہیت و ہیئت، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے غزل کے نئے رنگ ترنم
اور پروفیسر وقار عظیم نے اکبر کی غزلیہ شاعری پر بحث کی ہے، مواد و معلومات کے لحاظ سے ڈاکٹر
خواجہ احمد فاروقی کا مضمون "ماسٹر رام چندر" اور جگن ناتھ آزاد کا مضمون "اقبال کے کلام کا
متصوفانہ لب و لہجہ" قابل ذکر ہیں، چند مضامین میں مختصر افسانہ، ڈرامہ، داستان و ناول اور
اردو کے مزاحیہ و طنزیہ ادب کا مختصر جائزہ اور ان کی عہد بعہد ترقیوں کا ذکر ہے، اس مجموعہ میں

مقدمہ کے علاوہ ۲۷ مضامین ہیں، اتنے مضامین میں رطب و یابس، غیر معتدل خیالات اور
ان میں تضاد کا پایا جانا عجیب نہیں ہے، ایسے متنوع مجموعہ کا اردو کی سنجیدہ علمی و مذہبی خدمات
کے ذکر سے خالی ہونا ایک بڑی کمی ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر مجموعی حیثیت سے یہ انتخاب
مختلف النوع مضامین کا ایک حسین گلدستہ اور مرتب کی خوش مذاقی کا نمونہ اور اصحاب ذوق
کے مطالعہ کے لائق ہے،

انوار الصفا - مرتبہ مولوی خصلت حسین صابری صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت
وطباعت معمولی، صفحات ۷۰۶، ۳ مجلد، قیمت للعہ/ پتہ: مولوی شمس الدین تاجر کتب
مسلم مسجد انارکلی چوک لاہور۔ ہندوستان میں: مکتبہ تجلی دیوبند، کتب خانہ انجمن ترقی
اردو، جامع مسجد دہلی ۶ وغیرہ۔

اس کتاب میں صحابہ، تابعین اور اولیاے کرام کے مختصر حالات و مناقب اور ان کے
بعض حکیمانہ اور سبق آموز اقوال جمع کیے گئے ہیں، پہلے حصہ میں چالیس احادیث نبوی اور خطبہ
حجۃ الوداع کے بعض اہم حصے، خلفائے راشدین اور ۷ دوسرے اجلہ صحابہ، ۲۶ تابعین اور
۸ تبع تابعین کے جن میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں، فضائل و مناقب اور زریں اقوال نقل کیے گئے
ہیں، دوسرے حصہ میں بیرون ہند کے ۹ اور ہند و پاک کے ۲۸ بزرگان دین اور اکابر صوفیہ کا
تذکرہ اور ان کے سبق آموز ملفوظات ہیں، اس طرح یہ کتاب صلحا و اخیار امت کا مختصر تذکرہ
بھی ہے، اور ان کے ملفوظات، مواعظ اور تعلیمات کا گنجینہ بھی، کتاب کے مندرجات اگرچہ
مستند ہیں، لیکن زیادہ تر اردو کتابوں اور ترجموں سے لیے گئے ہیں،

مذہب اور لامذہبیت کی کشمکش
پانچ مقالے
از جناب صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۸۲ قیمت ۶ عہ

پتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

صوفی نذیر احمد صاحب موجودہ حالات اور بالخصوص مسلمانوں کے مسائل و معاملات پر مبصرانہ اور گہری نظر رکھتے ہیں، اور ان کے حل کی مفید تجویزیں اور مشورے بھی پیش کرتے رہتے ہیں اس رسالہ میں جو پانچ مقالوں پر مشتمل اور صوفی صاحب کے گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے، موجودہ مذاہب اور نظاموں بالخصوص مارکسزم کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اس کے خطرناک پہلوؤں سے اسلامی ملکوں کو متنبہ کیا گیا ہے، اور موجودہ دینی و لادینی کشمکش میں مسلمانوں کی برکت و حرکت کے اسباب اور اسلام کے نظام امن و فلاح اور ملت کی تنظیم وغیرہ پر بحث کر کے دکھایا گیا ہے کہ تمام مخلوقات کی طرح انسان کا آئین فلاح و بقا بھی اس کے اخلاقی و روحانی شعور و کردار کی شکل میں موجود ہے، گو صوفی صاحب کی تحریروں میں ظاہری جاذبیت اور دلکشی نہیں ہوتی اور انکے بعض افکار و خیالات پیچیدہ اور گنجلک ہوتے ہیں لیکن ان میں بہت گہری اور کام کی باتیں ہوتی ہیں یہ مقالے بھی اس سے خالی نہیں ہیں اور یہ مسلمانوں کے غور و فکر کے لائق ہیں۔

موضح القرأت فی السبع المتواترات

مرتبہ مولانا قاری حافظ محمد حبیب اللہ خاں صاحب

بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات تقریباً ۱۱۲، قیمت ۳ر، پتہ: مدرسہ تجوید القرآن فاروقی مسجد، میری ویدر ٹاور، کراچی ۲ (پاکستان)

اس کتاب میں قرآن مجید کی سات مشہور و متواتر قرأتوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے، جس سے ان کا فرق و اختلاف بالکل واضح ہو جاتا ہے، شروع میں قرأت و تجوید کے قاعدے، اصطلاحات، جائز و ناجائز وجوہ کی تفصیل اور ساتوں مشہور ائمہ قرأت کے علاوہ انکے دو دو مشہور رواۃ کے مختصر حالات و سوانح بھی بیان کیے گئے ہیں، ان حالات کو سوانح قراء سبعہ کے نام سے الگ بھی شائع کیا گیا ہے، یہ کتاب کا پہلا جزء ہے جو پارہ الم کے اختلاف قرأت پر مشتمل ہے، قرأت کا دار و مدار مشق و ممارست پر ہے اور اسکی تحصیل صاحب فن استاد کے بغیر محض کتابوں سے ممکن نہیں ہے اسلیے اس رسالہ سے قرأت و تجوید کے طلبہ و اساتذہ ہی خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

"ض"

جلد ۱۰۰ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۷ء عدد ۲

مضامین